بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

تحریک ادب

شمارہ73، جنوری-2024 جلدنمبر 17

Tahreek-e-adab vol-17, issue-73, January 2024

مدیر Editor

جاوید انور (ڈاکٹر جاوید احمد) **Jawed Anwar** (Dr.Jawed Ahmad)

cell-0091-9935957330

مجلس ادارت

Editorial board and Peer Review committee

پروفیسر صغیر افراہیم، سابق صدر شعبۂ اُردو، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی

Prof. Sagheer Afrahim Ex.Chairman Dept.of Urdu A.M.U.

پروفیسر شہاب عنایت ملک، سابق صدر شعبہ اردو، جموں یونیورسٹی

Prof.Shohab Inayat Malik Ex.HOD Urdu,Jammu University

پروفیسر محفوظہ جان، صدر، شعبہ کشمیری، کشمیر یونیورسٹی

Prof. Mahfooza Jaan(H.O.D.Kashmiri,Kashmir University)

ڈاکٹر شمس کمال انجم، صدر شعبہ عربی، بابا غلام شاہ بادشاہ یونیورسٹی

Prof.Shahina Rizvi(Ex.HOD,Urdu,MKVP University,VNS.)

پروفیسر شاہینہ رضوی (سابق صدر، شعبہ اردو، مہاتما گاندھی کاشی ودیاپیٹھ یونیورسٹی، وارانسی)

Dr. Shams Kamal Anjum, H.O.D. Arabic, Baba Ghulam Shah Badshah University,Rajouri (J&K)

ڈاکٹر دبیر احمد، صدر شعبہ اردو، مولانا آزاد پی۔جی۔کالج، کولکاتا

Dr. Dabeer Ahmad,H.O.D.Urdu, Maulana Azad P.G. College,Kolkata

ڈاکٹر احسان حسن، شعبہ اردو، بنارس ہندو یونیورسٹی

Dr.Ehasan Hasan,Dept of Urdu BHU Varanasi

مجلس مشاورت

Advisery Board and Peer Review committee

نجمہ عثمان، پروفیسر عارفہ بشریٰ، رشید احمد، ڈاکٹر فروز حیدری،
عرفان عارف، ڈاکٹر چمن لال

Najma Usman(Surrey, United Kingdom)

Prof. Arifa Bushra(Dept. of Urdu,Kashmir University)

Rasheed Ahmad(Chairman Rosewood Academy,VNS

Irfan Arif(H.O.D.Dept. of Urdu,Govt.SPMR College of Commerce,Cluster University of Jammu,Jammu)

Dr.Chaman Lal Bhagat(Asst. Prof.Dept. of Urdu,Jammu University,Jammu)

Name Tahreek-e-Adab(Urdu Monthly)

ISSN 2322-0341

سال اشاعت: Year of Publication 2024 (جلد نمبر 17) Vol-17

شمارہ نمبر ،شمارہ 73۔جنوری، 2024 Issue November

سرنامہ خطاط: انور جمال Title name Artist : Anwar Jamal, Varanasi

سرورق : عظمی اسکرین Title cover Uzma Screen, Varanasi

فی شمارہ : دوسو روپے 200/-Two Hundred rs. per copy

زرسالانہ : دو ہزار روپے (رسالہ صرف رجسٹرڈ ڈاک سے ہی بھیجا جائے گا)

Annual Membership 2000/- rs. two Thousand Rupees

تاعمر خریداری (ہند): بیس ہزار روپے

Life Time: 20000/- Twenty Thousand rs.(only india)

چیک یا ڈرافٹ اور انٹرنیٹ بینکنگ کے ذریعے زر رفاقت یہاں ارسال کریں۔

Please send your subscription amount or donation through cheque,draft or internet banking on the following:

Jawed Ahmad IFSC SBIN0005382 A/C no. 33803738087

State Bank Of India,Branch-Shopping centre(B.H.U.Campus.B.H.U.Varanasi-221005(U.P) India

اس شمارہ کی مشمولات میں اظہار کیے گئے خیالات ونظریات سے ادارے کا متفق ہونا ضروری نہیں۔

The content/idea expressed in any article of this journal is the sole responsibility of the concerned writer and this institution has nothing to do with it.

متنازعہ تحریر کے لیے صاحب قلم خود ذمہ دار ہے۔تحریک ادب سے متعلق کوئی بھی قانون چارہ جوئی صرف وارنسی کی عدالت میں ممکن ہوگی۔

Any legal matter pertaining to tahreek-e-adab will be possible only in the jurisdiction of Varanasi court.

جاوید انور مدیر تحریک ادب نے مہاویر پریس، وارانسی سے شائع کرار دو آشیانہ ۱۶۷، آفاق خان کا احاطہ، منڈواڈیہہ بازار، وارانسی سے تقسیم کیا۔

Jawed Anwar Editor Tahreek-e-Adab has got this journal published from mahavir press, Varanasi and distribute it from Urdu Ashiana,167 Afaq Khan Ka Ahata,Manduadeeh Bazar,Varanasi-221103

فہرست

مضامین:

1۔موت خاتمہء حیات نہیں	مولانا وحیدالدین خاں	6
2۔کامیاب شاعری کے چند نمایاں نقوش	اسلم عمادی	15
3۔نرگس کی آخری گواہی	ڈاکٹر گل جبین انصاری	24
4۔شمشاد شاد کی شاعری کا تنقیدی مطالعہ	وفا نقوی	30
5۔روبینہ میر کی شاعری میں نسائی حسیت	محمد شبیر	39
6۔حامدی کاشمیری اور ان کی غزل گوئی	عبداللہ کھانڈے	45
7۔اردو غزل میں علم نباتات کی ترجمانی کرنے والا شاعر: زینت اللہ جاوید	محمد عادل	51
8۔تصوف اور اردو شاعری	فرزانہ انصاری	62
9۔کشمیری صوفی شاعری کا متنی مطالعہ	ڈاکٹر نثار احمد	70
10۔رئیس احمد کمار کی افسانچہ نگاری	مزمل حمید	75
11۔غوث خواہ مخواہ کی مزاحیہ اور شگفتہ شاعری	شہاب الدین	80
12۔جموں وکشمیر کا ایک منفرد قلمکار؛ پرویز مانوس	مزمل حمید	86

غزلیں:

خالد جمال، خورشید بسمل، ڈاکٹر بختیار نواز، ڈاکٹر راکیش کمار طالب — 91

نظم:

(چار بیٹے) — گل جہاں — 94

افسانے:

1۔ رانی کے ہیرا موتی — نجمہ عثمان — 95

2۔ اڑان — طارق شبنم — 107

3۔ کل، آج اور کل — ڈاکٹر ساجد علی — 112

Maut Khaatma-e-Hayat nahin by Maulana Wahiduddin Khan ؒ

مولانا وحیدالدین خاں

موت خاتمۂ حیات نہیں

موجودہ دُنیا میں انسان کے ساتھ جو حادثات پیش آتے ہیں ان میں سب سے بڑا حادثہ موت کا حادثہ ہے۔ موت ہر شخص کی زندگی میں ایک ایسا فیصلہ کن زلزلہ ہے جس سے بچنا کسی کے لئے بھی ممکن نہیں۔ کوئی بھی تدبیر اتنی طاقتور نہیں جو موت کو ٹالنے میں کارآمد ہو سکے۔ موت کا شکار ہر آدمی لازمی طور پر ہوتا ہے خواہ وہ غریب ہو یا امیر، خواہ وہ بے زور ہو یا زور آور۔ یہی وجہ ہے کہ ہر دَور کا انسان موت کے بارے میں انتہائی سنجیدگی سے سوچتا رہا ہے۔ موت کی یاد ہر آدمی کی خوشیوں کے چراغ کو بجھا دیتی ہے۔ ہر آدمی یہ سوچنے پر مجبور ہوجاتا ہے کہ کیا پیدا کرنے والے نے مجھ کو اسی لئے پیدا کیا تھا کہ میں چند سال زندہ رہ کر ختم ہوجاؤں، ایک محدود مُدت دُنیا میں گزار کر اس طرح یہاں سے جاؤں کہ میری کوئی بھی کامیابی موت کے اس سفر میں میرے ہمراہ نہ ہو۔

اس معاملے میں اسلام ہر انسان کے لئے اُمید کا ایک چراغ ہے۔ اسلام کی صورت میں اللہ تعالیٰ نے اپنا جو تخلیقی منصوبہ انسان پر منکشف کیا ہے، وہ بتاتا ہے کہ موت زندگی کا خاتمہ نہیں، موت دراصل ایک درمیان وقفہ ہے جس کے بعد آدمی اپنے اگلے مرحلۂ حیات میں داخل ہوجاتا ہے۔ اس دوسرے مرحلۂ حیات میں انسان اسی طرح ایک زیادہ کامل اور وسیع دنیا میں جئے گا جس طرح وہ موجودہ دنیا میں نسبتاً بہت مختصر اور کمتر زندگی گزار رہا تھا۔

اسلام کے ذریعہ یہ خبر جو انسان کو دی گئی ہے وہ ہر مرد و عورت کے لئے زندگی کا نیا پیغام ہے۔ اس خبر کی صورت میں آدمی اس امکان کو دریافت کرتا ہے کہ وہ اگلی دنیا کے قوانین کو جانے اور اس کے مطابق زندگی گزارے تاکہ وہ موت کے بعد دوبارہ ایک نئی اور زیادہ بہتر زندگی پالے۔ اس تخلیقی منصوبہ سے بے خبری انسان کو اپنی زندگی کے بارے میں مایوسی میں مبتلا کرتی ہے مگر جب وہ اس تخلیقی منصوبہ کو جان لے تو اس کے بعد اس کے سامنے زندگی کا نیا وسیع تر دروازہ کھل جاتا ہے۔ وہ بظاہر اپنی محرومی میں ایک نئی یافت کا راز پالیتا ہے۔

ایک انوکھی خوشخبری:

قرآن کی سورۃ نمبر ۳۹ میں اللہ تعالیٰ نے اپنے پیغمبر کو خطاب کرتے ہوئے فرمایا ''تم کہہ دو کہ اے میرے بندو جنہوں نے اپنی جانوں پر زیادتی کی ہے، اللہ تعالیٰ کی رحمت سے مایوس نہ ہو۔ بے شک اللہ تعالیٰ تمام گناہوں کو معاف کر دیتا ہے، وہ بڑا بخشنے والا مہربان ہے۔'' (الزمر ۵۳)

قرآن کی یہ آیت انسان کے لئے ایک عظیم خوشخبری ہے۔ موجودہ دُنیا میں زندگی گزارتے ہوئے ہر آدمی سے طرح طرح کی کوتاہیاں سرزد ہوتی رہتی ہیں۔ ان گناہوں کا انجام اگر لازمی طور پر بھگتنا ہو تو انسان کے لئے زندگی کتنی بڑی مصیبت بن جائے۔ مگر خدا کی کتاب انسان پر یہ راز کھولتی ہے کہ اس کے لئے اس معاملہ میں مایوسی کا کوئی سوال نہیں۔ گناہوں سے معافی کا یہ راز کیا ہے۔ وہ ہے گناہ پر شرمندگی اور اللہ کی طرف دوبارہ رجوع کرنا۔ اللہ تعالیٰ نے جس طرح کچھ اعمال کو گناہ قرار دیا ہے اسی طرح اس نے اس دنیا میں اِمکان بھی رکھ دیا ہے کہ گناہ سرزد ہونے کے بعد آدمی اپنے کو اس سے پاک وصاف کر سکے۔ وہ خدا کی دنیا میں ایک بے گناہ انسان کی حیثیت سے داخل ہو۔ قرآن کی ایک اور آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ خدا نے انسان کے لئے یہ عجیب امکان بھی رکھا ہے کہ اس کا گناہ بدل کر اس کے لئے نیکی بن جائے (الفرقان ۷۰)۔

وہ اس طرح کہ گناہ کے بعد جب آدمی شرمندہ ہوتا ہے اور گریہ وزاری کے ساتھ اللہ کی طرف رجوع کرتا ہے تو یہ گویا ایک ایسا واقعہ ہوتا ہے جب کہ اس کا گناہ اس کے لئے ایک نیکی کا سبب بن گیا۔ ابتداً اگر وہ خدا سے دُور ہوا تھا تو بعد کے مرحلہ میں وہ خدا سے اور زیادہ قریب ہو گیا۔ اس کی یہ روش خدا کو اتنا زیادہ پسند آتی ہے کہ اس کے گناہ کو بھی نیکی کے خانہ میں لکھ دیا جاتا ہے۔ خدا کا یہ قانون جو قرآن کے ذریعہ کھولا گیا ہے انسان کے لئے ایک عجیب نعمت ہے۔ وہ انسان کے لئے لازوال تسکین کا سرمایہ ہے۔

قناعت ایک نعمت:

حدیث میں آیا ہے کہ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا، قد افلح من أسلم ورزق کفافاً وقنعہ اللہ بما آتاہ۔ (مسند الامام احمد، ۲/ ۱۶۸) یعنی وہ شخص کامیاب ہوا جس نے اسلام قبول کیا اور اس کو بقدر ضرورت روزی ملی اور اللہ کی توفیق سے وہ اس پر قانع رہا جو اللہ نے اس کو دیا تھا۔ موجودہ دُنیا میں ہمیشہ ایک انسان اور دوسرے انسان کے درمیان اونچ نیچ رہتی ہے۔ اس بنا پر اکثر انسان سکون سے محروم زندگی گزارتے ہیں۔ وہ ان لوگوں کو دیکھتے رہتے ہیں جن کو ان سے زیادہ ملا ہوا ہے۔ اس طرح

وہ مسلسل طور پر ایک قسم کی حسرت کی نفسیات میں مبتلا رہتے ہیں اور اسی حال میں مَر جاتے ہیں۔ اس کا حل اسلام میں قناعت بتایا گیا ہے۔ قناعت آدمی کو اس قابل بناتی ہے کہ وہ ملے ہوئے پر مطمئن رہے اور نہ ملے ہوئے کے غم میں اپنے آپ کو ہلکان نہ کرے۔ اسلام کی تعلیم کے مطابق دُنیا میں ہر ایک کو وہی ملتا ہے جو خدا نے اس کے لئے مقرر کر دیا ہے۔ جس آدمی کو کم ملا وہ بھی خدا کے حکم سے تھا اور جس کو زیادہ ملا وہ بھی خدا کے حکم سے تھا۔

یہ عقیدہ آدمی کو اَبدی سکون عطا کرتا ہے۔ وہ اس یقین میں جینے لگتا ہے کہ اس کو جو کچھ ملا وہ اتفاقاً نہیں تھا بلکہ یہ عین وہی ہے جو خود اس کی بہتری کے لئے اس کو ملنا چاہئے تھا۔ اگر ایک شخص کو بظاہر دُنیا کا رزق کم ملا ہے تو یہ اس کے حق میں خدا کی ایک عظیم مہربانی ہے۔ اس طرح خدا چاہتا ہے کہ وہ شخص ظاہری ساز وسامان میں زیادہ مصروف نہ ہوسکے۔ وہ خارجی ظواہر سے بلند ہوکر معنوی حقائق میں زیادہ سے زیادہ مشغول ہو۔ مادّی چیزوں میں کم پر راضی ہونے کا نام قناعت ہے۔ اسی طرح مادّی چیزوں میں زیادہ کا طالب بننے کا نام حرص ہے۔ اس دنیا کا قانون یہ ہے کہ جو آدمی قناعت کی روش پر قائم ہو اس پر ہر قسم کے علمی دروازے کھلتے چلے جائیں گے، اس پر معرفت اور روحانیت کی بارشیں ہوں گی۔ اس کے برعکس جو آدمی حرص وہوس کا طریقہ اختیار کرے وہ ظواہر کی محدود دُنیا میں گُم ہوکر رہ جائے گا۔ حقائق کی وسیع تر دُنیا اس کی دَسترس سے باہر ہوگئی۔ وہ ایک خوشنما حیوان کی طرح زندگی گزارے گا، وہ انسانیت کا اعلیٰ درجہ پانے سے محروم رہے گا۔ کم پر قناعت کرنا کوئی سادہ بات نہیں۔ یہ ایک اعلیٰ انسانی صفت ہے۔ جو آدمی مادّی چیزوں میں کم پر راضی ہوجائے وہ گویا غیر مادّی چیزوں میں اپنے آپ کو زیادہ کا مستحق بنا رہا ہے۔ وہ غیر اہم چیزوں میں پیچھے کی سیٹ کو قبول کر کے زیادہ اہم چیزوں میں آگے کی سیٹ پر اپنے لئے زیادہ بہتر جگہ حاصل کر رہا ہے۔

تکلیف میں راحت: پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا، مایصیب المسلم من نصب ولا وصب ولا ھمّ ولا حزن ولا اذی ولا غم ۔حتی الشوکۃ یشا کھا۔ الا کفّر اللہ بھا من خطایاہ۔ (فتح الباری بشرح صحیح البخاری ۱۰/۷/۱) یعنی جب بھی کسی مسلم پر کوئی تھکان یا درد رنج یا حزن یا تکلیف یا غم پہنچتا ہے یہاں تک کہ اگر کوئی کانٹا چبھتا ہے تو اللہ ضرور ان مصیبتوں کو اس کی خطاؤں کے لئے کفارہ بنا دیا ہے۔ یہاں مسلم سے مُراد وہ انسان ہے جس کو حقیقت کی پہچان ہوگئی ہو۔ جو چیزوں کو اس کے صحیح رُخ سے دیکھنے کے قابل ہوجائے، جو خدا کی خدائی کو دریافت کرلے اور اسی کے ساتھ انسان کی انسانیت کو بھی۔

ایسا انسان اپنی حقیقت شناسی کی بنا پر وہ انسان بن جاتا ہے جو ہر آنے والی صورتحال کا صحیح

جواب(response) دے سکے۔ایسے انسان پر جب کوئی چھوٹی یا بڑی مصیبت آتی ہے تو وہ اس کی سوچ کو جگانے کا ذریعہ بن جاتی ہے۔ایسے تجربات کے درمیان وہ اپنے عجز کو دریافت کرتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ مصیبت کے وقت فریاد اور شکایت کرنے کے بجائے وہ قادر مطلق خدا کو یاد کرنے لگتا ہے۔ان تجربات کے درمیان وہ اپنی حیثیت واقعی ادراک کر لیتا ہے۔

اس معاملے کو دوسرے لفظوں میں اس طرح کہا جاسکتا ہے کہ مسلم وہ ہے جو زندگی کے تلخ تجربات کو منفی معنوں میں لینے کے بجائے ان کو مثبت معنوں میں لے سکے۔مسلم انسان کی یہ مصفت اس کے لئے اپنی غلطیوں اور کوتاہیوں کی اصلاح کا محرک بن جاتی ہے۔دُنیا کی ہر ٹھوکر اس کو مجبور کرتی ہے کہ وہ اپنے معاملے پر اَز سرِ نو غور کرے۔وہ اپنا احتساب آپ کرنے لگے۔اصلاحِ خویش کے اس عمل کا دینی نام کفارہ ہے۔اسلام کا یہ اصول انسان کے لئے ایک عظیم خوشخبری ہے۔اس دُنیا میں ہر آدمی کو بار بار مختلف قسم کیم مصیبتیں پیش آتی ہیں۔ آدمی اگر باشعور نہ ہو تو دنیا کی مصیبت اس کے لئے صرف مصیبت یا تکلیف ہوگی،اس سے زیادہ اور کچھ نہیں۔مگر جو انسان صاحب معرفت ہو،جس کے ایمان نے اس کو باشعور بنا دیا ہو وہ اس پوزیشن میں ہوجاتا ہے کہ اپنی تکلیف کو بھی راحت بنا سکے ،اپنے نہیں کو ہے میں تبدیل کر سکے۔وہ کھونے کو بھی اپنے لئے پانا بنالے۔

اسلام کا یہ تصوّر انسان کے لئے ایک عظیم نعمت ہے، وہ تکلیف کے احساس کو بھی راحت کے احساس میں بدل دیتا ہے۔اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ آدمی پر جب کوئی چھوٹی بڑی مصیبت پڑتی ہے تو وہ کبھی گھبراہٹ میں مبتلا نہیں ہوتا۔ ہر مصیبت کے موقع پر وہ یہ سوچ کر مطمئن ہوجاتا ہے کہ اس مصیبت نے میری زندگی کی کسی غلطی کو میرے اعمال کے ریکارڈ سے مٹا دیا۔ مجھے قصوروار انسان کے مقام سے اُٹھا کر بے قصور انسان کی صف میں پہنچا دیا۔

توکل اور اعتماد: اسلام کی ایک اہم تعلیم وہ ہے جس کو توکل علی اللہ کہا جاتا ہے۔یعنی ہر حال میں اللہ کے اوپر بھروسہ رکھنا، اللہ کی رحمت سے کبھی نا اُمید نہ ہونا،قرآن میں حکم دیا گیا ہے کہ ''اور تم اللہ پر توکل کرو،اور اللہ کارساز ہونے کے لئے کافی ہے۔(الاحزاب ۳) دوسری جگہ قرآن میں ارشاد ہوا ہے کہ تم اللہ پر توکل کرو اگر تم مومن ہو۔(المائدہ ۲۳) اسی طرح قرآن میں اہل حق کی زبان سے کہا گیا ہے کہ ''اور جو تکلیف تم ہمیں دو گے ہم اس پر صبر کریں گے، اور بھروسہ کرنے والوں کو اللہ ہی پر بھروسہ کرنا چاہئے''۔(ابراہیم ۱۲) اسی طرح قرآن میں بتایا گیا ہے کہ تم اس طرح کہو کہ ''اللہ میرے لئے کافی ہے، بھروسہ کرنے والے اسی پر بھروسہ کرتے ہیں۔(الزمر ۳۸)

توکل کا عقیدہ اُمید اور یقین کا لازوال سرچشمہ ہے۔ یہ عقیدہ آدمی کو یہ یقین عطا کرتا ہے کہ جہاں تمہاری کوششوں کی حد آجائے وہاں ایک اور ہستی تمہاری مدد کے لئے موجود رہتی ہے جس کی کوئی حد نہیں۔ جہاں معلوم اسباب ختم ہوگئے ہوں وہاں نامعلوم اسباب کا کبھی نہ ختم ہونے والا ذریعہ تمہارا ساتھ دینے کا انتظار کر رہا ہے۔ جہاں تم اپنی طاقت سے کامیاب نہیں ہوسکتے وہاں تمہارا خدا اپنی لامحدود طاقتوں کے ساتھ تم کو کامیاب بنانے کے لئے موجود ہے۔ توکل کا یہ عقیدہ اہل ایمان کا سب سے بڑا سرمایہ ہے۔ وہ آدمی کو یہ یقین عطا کرتا ہے کہ بظاہر حوصلہ شکن حالات میں بھی اس کا حوصلہ نہ ٹوٹے۔ بظاہر نا اُمیدی کے طوفان میں بھی وہ اپنی اُمید کو برقرار رکھے۔

اس پہلو سے غور کیجئے تو معلوم ہوگا کہ ایک شخص کا اسلام کے عقیدہ پر کھڑا ہونا کوئی سادہ بات نہیں۔ یہ اٹل حوصلہ کی زمین پر کھڑا ہونا ہے۔ یہ ناقابل شکست عزم کی چٹان پر کھڑا ہونا ہے۔ یہ ایک ایسی برتر اُمید پر کھڑا ہونا ہے جو طوفانی حالات میں بھی آدمی کو مایوسی سے بچائے رکھے۔ جو اس کو ہر حال میں عزم و ہمت کا پیکر بنائے رہے۔

ناخوشگواری میں خوشگوار پہلو: قرآن کی سورہ نمبر ۲ میں فطرت کا ایک قانون ان الفاظ میں بیان کیا گیا ہے۔ وعسی ان تکرھوا شیئاً وھو خیر لکم وعسی ان تحبّوا شیئاً وھو شر لکم واللہ یعلم وانتم لاتعلمون۔ (البقرہ ۲۱۶) یعنی ہوسکتا ہے کہ تم ایک چیز کو ناگوار سمجھو اور وہ تمہارے لئے بھلی ہو۔ اور ہوسکتا ہے کہ تم ایک چیز کو پسند کرو اور وہ تمارے لئے بُری ہو۔ اور اللہ جانتا ہے اور تم نہیں جانتے۔

انسان ایک ایسی دُنیا میں جیتا ہے جہاں اسکے سوا بے شمار دوسرے اسباب ہیں جو رات دن اپنا کام کر رہے ہیں۔ موجودہ دنیا میں جو واقعات پیش آتے ہیں وہ زیادہ تر انہیں خارجی اسباب کا نتیجہ ہوتے ہیں۔ اس بنا پر بار بار ایسا ہوتا ہے کہ ایک آدمی کی زندگی میں کوئی ایسا واقعہ پیش آتا ہے جو اس کی خواہش یا اس کے اپنے منصوبہ کے خلاف ہو۔ اگر آدمی زیادہ باشعور نہ ہو تو وہ ایسے واقعات کو دیکھ کر گھبرا جائے گا۔ وہ اپنے کو ایک مصیبت زدہ یا ناکام انسان سمجھ لے گا۔

قرآن کے مذکورہ بیان میں ایسے انسان کے لئے ایک عظیم رہنمائی ہے۔ یہ رہنمائی انسان کو ایک مستقل سکون عطا کرتی ہے۔ وہ انسان کو اس قابل بناتی ہے کہ وہ مصیبت کے لمحات میں بھی یہ سوچ کر مطمئن رہے کہ اس مصیبت میں بھی یقیناً راحت کا کوئی پہلو چھُپا ہوا ہوگا۔ وہ انسان کو اس قابل بناتی ہے کہ مشکل لمحات میں بھی وہ انتظار کی پالیسی اختیار کرے۔ وہ اپنے ناخوشگوار حال میں ایک خوشگوار مستقبل کا منظر پیشگی طور پر دیکھنے لگے۔

ایسا انسان اپنے اس مزاج کی بناء پر ایک بے پناہ انسان بن جاتا ہے ۔ وہ اس قابل ہوجاتا ہے کہ وہ اپنے وقت یا اپنے وجود کا کوئی حصہ بے فائدہ طور پر ضائع نہ ہونے دے ۔ وہ اس المناک انجام سے محفوظ رہے کہ ایک ناخوشگوار صورتحال سے متاثر ہوکر وہ اپنے آپ کو ہلاک کرلے ۔ حالانکہ آئندہ آنے والے حالات اس کے لئے ایسی خبریں لائیں جو عین اس کے حق میں ہوں اور مزید اضافے کے ساتھ ٹھیک وہی ہو جس کو وہ اپنے لئے چاہ رہا تھا۔

کمزور اور طاقتور: حدیث میں آیا ہے کہ ایک شخص کے یہاں دو بھائی تھے۔ ایک بھائی کا کاروبار سنبھالتا تھا اور دوسرا بھائی دینی کاموں میں مصروف رہتا تھا۔ پہلے بھائی نے رسول ﷺ سے دوسرے بھائی کی شکایت کی اور کہا کہ وہ گھر کے کاروبار میں حصہ نہیں لیتے ۔ آپ ﷺ نے فرمایا کہ شاید تم کو اُسی کی وجہ سے روزی مل رہی ہو۔ (لعلک ترزق بہ) اسی طرح ایک اور روایت کے مطابق ، پیغمبر اسلام ﷺ نے فرمایا ، اِنما تنصرون وترزقون بضعفائکم (فتح الباری بشرح صحیح البخاری ۶/ ۱۰۵۔ ۱۰۴) یعنی تم کو جو مدد ملتی ہے یا جو رزق ملتا ہے وہ صرف تمہارے کمزوروں کی وجہ سے ملتا ہے۔

عام طور پر ایسا ہوتا ہے کہ ہر گھر میں اور ہر سماج میں ایسے افراد ہوتے ہیں جو بظاہر کمزور ہوتے ہیں، ترقیاتی سرگرمیوں میں بظاہر اُن کا کوئی حصہ نہیں ہوتا۔ ایسے افراد عام طور پر گھر میں بھی اور سماج میں بھی حقیر سمجھے جاتے ہیں۔ ان کو اجتماعی زندگی میں عزّت کا مقام نہیں ملتا۔ ایسے لوگ خود بھی مایوسی کا شکار رہتے ہیں اور دوسرے لوگ بھی ان کو شعوری یا غیر شعوری طور پر ایک بوجھ سمجھ لیتے ہیں نہ کہ اپنے حق میں کوئی مفید اثاثہ۔ ایسے حالات میں مذکورہ اسلامی تعلیم ایک عظیم سماجی نعمت ہے۔ یہ تعلیم بتاتی ہے کہ خدائی منصوبے کے مطابق ، سماج کی ترقیاتی سرگرمیوں میں ان کمزوروں کا بھی ایک عظیم حصہ ہے۔ کسی سماج میں ان کا وجود خدا کی رحمتوں کو اس طرف مائل کرنے کا سبب بنتا ہے۔ بظاہر نہ کرنے کے باوجود وہ سماج میں بہت بڑی خدمت انجام دیتے ہیں۔

یہ سادہ طور پر صرف ایک اخلاقی تعلیم نہیں ، یہ فطرت کا اٹل قانون ہے ، یہ خداوند عالم کا تخلیقی منصوبہ ہے۔ اس حقیقت کا شعور جب کسی سماج کے افراد میں پیدا ہوجائے تو ایسا سماج اپنے کمزوروں کے بارے میں آخری حد تک مہربان ہوجائے گا۔ وہ اپنے کمزوروں کو اپنے معاملات میں برابر کا حصہ دار سمجھے گا نہ کہ محض ایک ایک بے فائدہ بوجھ۔

مشکل میں آسانی: قرآن کی سورۃ نمبر ۹۴ میں بتایا گیا ہے کہ — پس مشکل کے بعد آسانی ہے

---بے شکل مشکل کے بعد آسانی ہے (الانشراح ۵-۶) ان الفاظ میں فطرت کا ایک قانون بتایا گیا ہے جس کو خدا نے ابدی طور پر پوری دنیا میں قائم رکھا ہے۔ آدمی خواہ کسی بھی ملک میں ہو، خواہ وہ کسی زمانے میں ہو، خواہ وہ کسی بھی حالت میں ہو، ہر جگہ اور ہر حال میں وہ فطرت کے اس قانون کو کارفرما پائے گا۔ موجودہ دنیا اس ڈھنگ پر بنی ہے کہ یہاں کسی بھی شخص کے لئے ہمیشہ یکساں حالات نہیں ہوتے مگر قرآن میں بیان کردہ مذکورہ فطری قانون بتاتا ہے کہ کسی بھی حال میں انسان کو بددل یا پست ہمت نہیں ہونا چاہئے۔ کیونکہ خود خالق عالم کے قائم کردہ اصول کی بنا پر ناموافق صورتحال میں ایک موافق امکان چھپا ہوا ہے۔ مثلاً ایک شخص کا باپ اس کی کم عمری میں انتقال کر جائے تو یہ بظاہر اس کے لئے ایک ناموافق بات ہے مگر اس حادثے کا موافق پہلو یہ ہے کہ باپ کے سائے سے محرومی اس کے اندر خود اعتمادی کی صفت جگانے والی ثابت ہوگی۔ ایک شخص غریب گھر میں پیدا ہو تو بظاہر یہ محرومی کی بات ہے مگر اس کا روشن پہلو یہ ہے کہ ایسا آدمی حالات کی بنا پر زیادہ محنت کرے گا اور زیادہ بڑی کامیابی حاصل کرے گا، وغیرہ۔

اسی طرح ہر مشکل، ہر محرومی اور ہر حادثے میں ہمیشہ ایک نیا اور بہتر امکان چھپا ہوتا ہے۔ ناموافق حالات چیلنج بن کر آدمی کو جھنجھوڑتے ہیں۔ وہ اس کی چھپی ہوئی صلاحیتوں کو بیدار کرتے ہیں۔ اس طرح ہر ناموافق جھٹکا آدمی کے لئے ترقی کا زینہ بنتا چلا جاتا ہے یہاں تک کہ وہ معمولی انسان سے اوپر اٹھ کر غیر معمولی انسان بن جاتا ہے۔

خوبی تلاش کرو: ایک روایت کے مطابق، پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا، لا یفرک مومن مومنۃ ان کرہ منھا خلقا رضی منھا آخر (مسند الامام احمد بن حنبل ۲/۳۳۹) یعنی کوئی مومن مرد کسی مومن عورت سے بغض نہ رکھے، اگر اس کے اندر کوئی ناپسندیدہ خصلت ہوگی تو اسی کے ساتھ اس کے اندر کوئی پسندیدہ خصلت بھی موجود ہوگی۔ اس حدیث میں مومن اور مومنہ سے مُراد مومن شوہر اور مومن بیوی ہیں۔

یہ اللہ تعالیٰ کا تخلیقی نظام ہے کہ کسی ایک مرد اور عورت کو تمام انسانی خوبی نہیں دی جاتی۔ ایک مرد اگر جسمانی حیثیت سے زیادہ طاقت ور ہو تو وہ دماغی صلاحیت کے اعتبار سے کم ہوگا، اسی طرح اگر کوئی مرد دماغ کے اعتبار سے غیر معمولی صلاحیت کا حامل ہو تو وہ جسم کے اعتبار سے ایک کمزور انسان ہوگا۔ اسی طرح ایک عورت کو اگر صورت کے اعتبار سے زیادہ حصہ ملا ہو تو سیرت کے اعتبار سے وہ زیادہ خصوصیات کی حامل نہ ہوگی اور اگر وہ سیرت میں ممتاز ہو تو صورت کے اعتبار سے وہ کوئی ممتاز

خاتون نہ ہوگی۔اس میں استثناء ہوسکتا ہے مگر عام اصول یہی ہے۔فطرت کا یہی اصول ہے جس کی طرف مذکورہ حدیث میں اشارہ کیا گیا ہے۔ یہ ایک ایسا اصول ہے جس میں ہرشادی شدہ جوڑے کے لئے کامیابی کا راز موجود ہے۔شادی شدہ زندگی کی ناکامی کا سبب اکثر حالات میں یہ ہوتا ہے کہ زوجین میں سے کوئی ایک دوسرے کو بظاہر اپنی مرضی کے مطابق نہیں پاتا،اس لئے وہ اس سے بددل ہوجاتا ہے مگر مذکورہ اصول کے مطابق،اس بدلی کا سبب یہ نہیں ہوتا کہ فریق ثانی فی الواقع ویسا ہی ہے جیسا کہ فریق اوّل اس کو سمجھ رہا ہے۔اس طرح کے معاملے میں عام طور پر ایسا ہوتا ہے کہ فریق اول کی رائے یکطرفہ ہوتی ہے۔ وہ فریق ثانی کی شخصیت کے ایک پہلو کو دیکھ کر اس سے بیزار ہوجاتا ہے حالانکہ اگر وہ فریق ثانی کے دوسرے پہلو کو دیکھے تو اس کے بارے میں اس کی رائے بالکل بدل جائے۔مثال کے طور پر ایک شوہر اپنی بیوی کو ظاہری خصوصیات میں کم پاتا ہے اوراس بنا پر وہ اس کو ناپسند کرنے لگتا ہے،لیکن اس کو جاننا چاہئے کہ یہی اس کی بیوی کی کل شخصیت نہیں،عین ممکن ہے کہ ظاہری کمی کے باوجوداس کی شخصیت میں اندرونی اخلاقی صفات بہت زیادہ موجود ہوں۔اور یہ ایک ثابت شدہ حقیقت ہے کہ کسی خاتون کے اندر سیرت وکردار کے اعلیٰ اوصاف ہونا خاندانی زندگی کے لئے زیادہ اہم حیثیت رکھتا ہے۔

فطرت کا نظام: قرآن کی سورہ نمبر ۹۰ میں اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد بیان ہوا ہے کہ،لقد خلقنا الانسان فی کبد (ہم نے انسان کو مشقت میں پیدا کیا ہے)اسی طرح قرآن میں دوسری جگہ بتایا گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اولادِ آدم کے بارے میں پیشگی طور پر یہ بتادیا تھا کہ دنیا میں تم لوگ ایک دوسرے کے دشمن ہوگے۔بعضکم لبعض عدو۔(البقرہ ۳۶)

قرآن کے اس بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ تکلیف (Suffering) موجودہ دنیا کا ایک لازمی حصہ ہے۔ یہ خالق فطرت کا مقرر کیا ہوا نظام ہے۔اس لئے اس کو ختم کرنا کسی کے لئے ممکن نہیں ۔ یہ انسانیت کے نام قرآن کا ایک عظیم فکری تحفہ ہے۔انسان اگر اس راز کو نہ جانے تو وہ غیر حقیقت پسند بنا رہے گا، وہ غیر ضروری طور پر ہمیشہ یہ کوشش کرے گا کہ وہ اپنے لئے ایک بے مشقت دنیا یا خرابیوں سے پاک سماج (evil-free society) بنا سکے مگر ساری کوشش کے باوجود وہ اس مقصد میں کامیاب نہ ہوگا۔ کیونکہ فطرت کے قانون کے مطابق ایسا ہونا ممکن نہیں ۔مگر جب وہ اس حقیقت کو جان لے گا تو وہ مسائل کے ساتھ جینے کی کوشش کرے گا اور پھر وہ اسی طرح اپنی پسند کی ایک دنیا بنالے گا جس طرح ایک درخت کانٹوں کے باوجود پھولوں اور پتیوں کے ذریعہ اپنی ایک

پُرکشش دنیا بنالیتا ہے۔حقیقت یہ ہے کہ زندگی کے مسائل انسان کے لئے مصیبت نہیں۔وہ انسان کے لئے ترقی کا زینہ ہیں۔یہ مسائل انسان کو بیدار کرتے ہیں۔وہ اس کی سوئی ہوئی صلاحیتوں کو حرکت میں لاتے ہیں۔وہ اس کے جمود کو توڑ کر اس کو مسلسل طور پر زندہ رکھنے کی ضمانت ہیں۔

مسائل زندگی کا لازمی حصہ ہیں۔مزید یہ کہ وہ ایک مفید حصہ ہیں، نہ کہ کوئی مضر حصہ۔جو لوگ اس حقیقت کو جان لیں وہ بے فائدہ چیزوں میں اپنی طاقت کو ضائع نہیں کریں گے۔وہ زندگی کی اعلیٰ تعمیر میں یقینی طور پر کامیاب رہیں گے۔

اقلیت کے لئے خوشخبری: قرآن میں بتایا گیا ہے کہ، کم من فئۃ قلیلۃ غلبت فئۃ کثیرۃ باذن اللہ واللہ مع الصابرین۔(البقرۃ،۲۴۹) یعنی کتنے ہی چھوٹے گروہ ہیں جو بڑے گروہ پر غالب آئے ہیں، اللہ کے اذن سے، اور اللہ صبر کرنے والوں کے ساتھ ہے۔

قرآن کی اس آیت میں فطرت کا ایک قانون بتایا گیا ہے، اس قانون کے مطابق اس دنیا میں عددا کثریت والا گروہ اگر بظاہر برتر دکھائی دیتا ہے تو عددی اقلیت والا گروہ امکانی طور پر اس سے بھی زیادہ برتر حیثیت رکھتا ہے۔اس دنیا میں فطرت کا قانون اکثریت سے زیادہ اقلیت کے حق میں ہے۔اس آیت میں اقلیتی گروہ کے لئے یہ خوشخبری ہے کہ اس کو اپنی عددی کمی کی بنا پر نا اُمیدی اور پست ہمتی کا شکار نہیں ہونا چاہئے اس کو چاہئے کو وہ اذن اللہ (قانونِ فطرت) پر بھروسہ کرتے ہوئے اپنے اندر پُرامید سوچ پیدا کرے۔یقینی ہے کہ کامیابی آخر کار اسی کو حاصل ہوگی۔

اقلیتی گروہ کس طرح اکثریتی گروہ پر غالب آسکتا ہے، اس کا جواب یہ ہے کہ جس سماج میں ایسا ہوتا ہے وہاں اکثریتی گروہ اقلیتی گروہ کے خلاف ایک مسلسل چیلنج بن جاتا ہے۔اکثریتی گروہ زندگی کے ہر میدان میں اقلیتی گروہ کو للکارنے لگتا ہے کہ اگر تم کو جینا ہے تو ہوشیار ہو جاؤ، تمہاری غفلت تم کو موت کے کنارے پہنچادے گی۔اکثریت کی طرف سے یہ چیلنج اقلیت کے لئے ایک زبردست تازیانہ کا کام کرتا ہے۔وہ چوکنا ہو کر زیادہ مستعدی اور زیادہ ہوشمندی کے ساتھ اپنا عمل کرنے لگتا ہے۔اکثریتی گروہ کا چیلنج اقلیتی گروہ کے افراد کی فطری صلاحیتوں کو آخری حد تک جگا دیتا ہے۔

آیت میں اذن اللہ کا مطلب یہی ہے۔جہاں بھی اکثریت اور اقلیت کا فرق پایا جائے وہاں خود بخود اذن اللہ کا یہ عمل جاری ہو جائے گا اور آخر کار اس کا وہی نتیجہ نکلے گا جس کی نشاندہی قرآن کی مذکورہ آیت میں کی گئی ہے۔

☆☆☆

Kamyab Shairi ke Chand Numayan Nuqoosh by Aslam Imadi

(Hyderabad) cell-9966683014

اسلم عمادی (حیدرآباد)

کامیاب شاعری کے چند نمایاں نقوش

صدیوں سے شاعری بنیادی طور پر مہذب گفتگو اور بے جھجک اظہار کا اہم الہ رہا ہے۔ ترتیل، غنائیت، ردیف وقافیہ کا التزام، ندرت اظہار، لہجہ کا زیر و بم اور ایسے ہی کئی عناصر شاعری کو اسالیبِ اظہار میں ممیز وممتاز رکھتے ہیں۔ اسے لئے دانشوروں، پیغمبروں، اولیا، صوفیا، مذہبی نغموں، اناشید، انقلابی نغمہ نگاروں، سادھو سنتوں، کتھاؤں اور کہانیوں میں شاعری اور شعری اہنگ بہت کامیاب استعمال ہوتا رہا۔

جب بھی کسی داعی یا رہنما کا کلامِ جمیل عوام اور خصوصاً نوجوان نسل کو اس حد تک متاثر کرنے لگے کہ وہ اپنی فکر، طرز حیات، اور سمتِ رہ نوردی میں بین فرق شامل کرنے لگے، تو لوگ اس کلام کو شاعری یا جادوگری سمجھنے لگتے۔ کلام الٰہی کو بھی اولاً شاعری سے نسبت دی جاتی رہی۔ جب تک کہ واضح اعلان نہ ہوا کہ یہ رب کریم کا کلام ہے۔ شاعری کا تاثر اتنا گہرا رہا کہ کئی ملکوں میں انقلاب اگیا، جابر اور ظالم نظام اس سے متزلزل ہوجاتا ہے، مثال کے طور پر جو تاثر ماضیِ قریب میں ''فیض کی نظم 'ہم دیکھیں گے'۔ ملکوں کی ازادی کی تحریک میں شاعری کا کلیدی رول رہا ہے۔ فلموں، داستانوں، ڈراموں، تقاریب، بغاوتوں، ازادی کی تحریکات، مذہبی اعمال ومجالس اور تقاریر ومضامین ہر نقطہ اظہار اور مرحلہ میں شاعری نے بہت اہم اور قوی رول ادا کیا ہے۔ شاعری وہ مقیاس جذبات ہے جو فرد کی ذہنی، فکری اور جذباتی قوت کے میزان اور الہ کی طرح اہم ہے۔

میرا ذاتی تجربہ یہ ہے کہ جب دل ازردہ ہو، سوچ زنگ الود ہو، جذبات پڑمردہ سے ہو جائیں تو کسی دلپذیر شاعر کا کلام پڑھنے یا سننے کی طرف مائل ہوجاتا ہو۔ اچھا کلام پڑھ کر یکا یک ذہن جاگنے لگتا ہے، بے دلی کی گرد صاف ہونے لگتی ہے۔ اسی طرح کسی مشاعرے یا ادبی مجلس کبھی بد نصیبی ناقص اور ردی کلام سن لیتا ہوں تو طبیعت منغض ہوکر رہ جاتی ہے۔ کبھی کبھی کسی ماہر صدا کار یا سنگر

کی اواز میں غالب، اقبال، فراق، مخدوم، فیض، ابن انشا، ساحر، مجروح، اور ایسے اکابرین کی شاعری دل میں جگہ کرنے لگتی ہے اور بار بار سننے کو جی چاہتا ہے۔ کچھ ایسے دل نواز اور دل پسند شاعر ہیں کہ مشاعروں میں ان کا کلام مقبول بھی اور حلقہ ہائے خاصانِ ادب میں بھی بے حد چاؤ سے سنے جاتے ہیں۔ مشہور ترین شعرا میں خمار بارہ بنکوی، احمد فراز، کلیم عاجز، راحت اندوری، منور رعنا، دلاور فگار، سعید شہیدی، امجد اسلام امجد، افتخار عارف، پروین شاکر، منیر نیازی اور ایسے بہت سے نام جدید و قدیم، نئے پرانے نام ہیں جن کی شرکت مشاعرے اور محفل کی کامیابی کی پہچان سمجھے جاتے ہیں۔ بہت سے شاعر اپنے معروف لحن اور پڑھنے کے سر اور تال کی بنا پر دل نوازی کی منزلوں میں رہے ہیں، بیکل اتساہی، زبیر رضوی، وسیم بریلوی، پیرزادہ قاسم، منظر بھوپالی اور ایسے ہی شاعروں نے جگر مرادابادی کی خوش گلوئی کا راستہ منتخب کیا۔ مگر کچھ لوگ میں نے ایسے دیکھے ہیں جنہوں نے ردی کلام کو اچھے لحن میں گا کر، یا مناسب کلام کو بھونڈے راگ میں پیش کر کے صورت حال کو بدمزگی اور بد رنگی میں بدل دیتے ہیں۔

شاعری کی مقبولیت سی متاثر ہو کے جو لوگ ردیف و قافیہ کی شد بد سے تھوڑی بھی شناسائی پا جاتے ہیں تو شاعر بننے کی حتی المقدور کوشش کرتے ہیں۔ استادوں کی تلاش کرتے ہیں یا ذاتی مطالعہ کو مہمیز کرتے ہیں۔ کچھ ایسے بھی نادان ہیں جو تک بندی اور قافیہ ارائی سے اگے نہیں بڑھتے۔

جیسا کہ میں نے پہلے بھی لکھا ہے غزلوں کی دنیا اردو ادب کی سب سے آباد دنیا ہے۔ غزل گو شعرا کی تعداد لاکھوں تک پہنچ گئی۔ غزل کا فارم بہت حد تک میکانکی تخلیق چاہتا ہے جس میں ردیف و قافیہ اور بحر و اوزان کے التزام سے دھڑا دھڑ غزلیں تخلیق ہوتی رہتی ہیں، اعداد و شمار اور تخمینہ کا عالمی پس منظر میں بہت دشوار ہوگا۔ اسی لئے کئی شعرا اس صورتحال سے زچ بھی ہو گئے اور کچھ تنقید نگاروں نے اس فارم کو ترک کرنے کی وکالت بھی کی۔ کچھ شاعروں کے اس تناظر میں درج ذیل اشارے قابلِ غور ہیں:

بہ قدر شوق نہیں ظرف تنگنائے غزل کچھ اور چاہئے وسعت مرے بیاں کے لئے۔ غالب

قافیوں کی تنگ گلیوں کا مجاور کر دیا تو نے کیسے کام پر مجھ کو مقرر کر دیا ۔ظفر اقبال

پڑھئے غزل اور اپ بھی مصرع لگائیے منزل بہت قریب ہے لنگڑاتے جائیے۔ فضیل جعفری

اس تمام تمہید کے باوجود یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ اچھے غزل گو صرف گنتی کے ہیں آخر اچھے شاعروں کی تعداد اتنی کم کیوں ہے۔ میں یہی کہہ سکتا ہوں کہ بیش تر شعرا نقارہء خلقِ خدا بن کر

مروجہ روایات سے کچھ اس طرح چپکے رہے کہ ان کی شاعری روندے ہوئے مضامین، بے جا تکرار، شعر برائے وزن بیت اور عمومیت، شاعر کہلانے کے لئے بے جان بے جا ندرت اور ایجاد سے عاری کلام سے شاعری میں غیر ضروری اضافے کرتے رہے ہیں۔ یہاں پر ایک اہم سوال اٹھتا ہے کہ اخر شاعر نے کس مقصود اور ہدف کے لئے شاعرانہ اظہار کے لئے منتخب کیا ہے:

۔سیاسی اور انقلابی موضوعات
۔سماجی مسائل کے ذکر اور ان کے حل کی تلاش سے متعلق
۔حمد و نعت اور قصیدہ، مثنوئ
۔حکومت وقت کہ تحسین و تنقید کی راہ میں
۔مذہبی اور دینی موضوعات کے احاطہ اور وعظ و پند و نصائح
۔عشقیہ گفتگو اور موضوعات ہجر و وصال سے متعلق
۔کہانی، قصہ اور تذکرہ واردات، داستان گوئی
۔اظہار ذات اور فرد کے احساساتِ درونی و خارجی
۔محفلوں اور مشاعروں میں فنکاری کے اظہار اور دعوی کے لئے
۔تفریح، ٹھٹھول، تماشہ گری،
۔فلم، ڈرامہ، اور میڈیا میں استعمال کے لئے

اس طرح اگر مقصود کا اندازہ ہو سکے تو پھر ناقد اور قاری کو شاعر کی کامیابی کو پرکھنے میں کچھ حد تک اسانی ہو سکتی ہے۔ یہ بات تو سب جانتے ہیں کہ طرز بیان اور اسلوب شاعر کے حقیقی لب و لہجہ کا آئینہ ہوتے ہیں۔ شاعر کے تحت الشعور میں جو مثبت سچ موجود ہے وہ اس کے اوڑھے ہوئے لہجے سے ہم آہنگ نہیں ہو سکتا۔ لیکن مثبت سچ اگر مثبت زبان میں منقوش ہو جائے تو ہم اس کی حقیقی شاعری کہہ سکتے ہیں۔ شاعر کے اندازِ بیان او خداداد شاعرانہ صلاحیت کی نمائندگی کرے گی۔ شاعری کی روح اس میں جذب شاعر کا ذاتی کرب ہے، ذاتی لہجہ ہے۔ سچ تو یہ ہے صناعی مرجاتی ہے لیکن سینے میں چھپا ہوا سچ اس کی چمک کو زندہ رکھتا ہے۔ جو لوگ نئے نئے شاعری کہنے کی طرف راغب ہوتے ہیں، وہ کامیابی اور شہرت کے مختلف زاویئے کھنگالتے ہیں۔ اور اپنی پسند سے اپنی راہ متعین کرتے ہیں، بہت سے ایسے بھی ہیں کہ بس ردیف و قافیہ کے سہارے کلام گھڑتے رہتے ہیں۔ چند مقبول زاویئے میرے گمان میں کچھ یوں ہیں:

۔جذباتی اور سیاسی باتیں جو لوگوں میں شہرت دیں
۔نرم اور میٹھے الفاظ جو جذبات کو سکون دیں
۔غنائیت ، راگ اور راگنی کا التزام : کہ مشاعروں اور محفلوں میں گا کر پیش کیئے جاسکیں۔
۔تلخ اور طنز یہ لہجہ
۔وطن پرستی اور مذہبی جذبات کو انگیختہ کرنے والی گفتگو
۔ بھاری بھر کم ،ثقیل اور قاموسی الفاظ وتراکیب جو سامع اور قاری کو مرعوب کر سکیں
۔ ہندی مائل ،مفرس اور معرب زبان کا انتخاب
۔ارادی ابہام اور دور رس موضوعات اور تراکیب کا انتخاب
۔رفاہ عام ،سماجی مسائل اور فائدہ مند موضوعات کے تحت درس جیسا کلام
۔جدت طرازی کے لئے جداگانہ ڈکشن میں کہنے کی جستجو
۔اور ایسے ہی عناوین

شاعر جن کا مزاج موزوں ہے وہ کچھ اس قسم کی لہروں میں غواصی کرتے ہیں۔اس کے علاوہ تک بندی کرنے والے بھی شاعروں کے بزم میں دراتے ہیں اور بات بات پر دادخواہ ہوتے ہیں۔ کچھ حضرات تماشہ گری اور جھوٹی شان کے پروردہ ہوتے ہیں۔یہی وجہ ہے کہ وہ شہرت کے پیچھے اندھے ہوتے ہیں۔انہوں نے سن رکھا ہوتا ہے کہ لڑکیاں مجاز ، اختر شیرانی ،ساحر اور اس طرح کے عظیم شاعروں کے عشق میں دیوانی ہوتی تھیں تو یہ بھی معشوق کا روپ دھارنے کی کوشش کرتے ہیں۔اپنے کردار میں ؛ان شاعروں کی حرکات ،سکنات ، رہن سہن داخل کر لیتے ہیں۔گفتگو میں لطیفہ گوئی غالب اور مجاز کی تقلید میں اجاتی ہے۔مضحکہ خیز حرکتیں کرنے لگتے ہیں ،، نہ ان کے شعر میں دم۔۔نہ ان کی تحریر میں قوت۔۔۔!!! لیکن دعوے بلند!!

اس بحث اور تحقیق میں آپ خود بہ خود اس مقام پر آجاتے ہیں جہاں آپ کو ترسیل کے تناظر میں شعر کے مقصد کو سمجھنے کی ضرورت پڑتی ہے۔ یہ امتیاز بھی لازم ہے کہ آپ کے زیرِ بحث ترسیل کے نقطہ نظر سے بیان یا نثری گفتگو، فنی نثر نہیں بلکہ شعر ہے اور شعر بہ ذاتِ خود سراسر ترسیل کی بجائے ایک لفظی فن پارہ ہے۔سامع اور قاری کو وہی شعر مناسب معلوم ہوتا ہے جو اس کی ذہنی کیفیت سے قریب تر ہو۔اس کی خواہش بس یہ ہوتی ہے کہ ایک نا آفریدہ فضا میں پہنچ جائے اور کچھ ایسے اس پر افکار کا انکشاف ہو کہ وہ کچھ لمحے کے لیے یا بلکہ بعض اوقات کچھ عرصہ تک اس جادو بیانی سے مسحور اور

متاثر رہ سکے۔لیکن یہ کیفیت اتنی مبالغہ آمیز، اضطراب کن اور مصنوعی نہ ہو کہ اس پر فحش، بے تکے اور جھوٹے ہونے کا گمان گذرے۔ترسیلِ شعر کا مقصد خوابوں کی فصل بونا بھی نہیں ہے اور نہ ہی یہ محض صحافتی زبان کا تماشا ہے۔زبان اور اندازِ ترسیل ایسے ہوں کہ شعر کے اندر چھپے ہوئے افکار کسی نادر انداز میں جھلکیں اور فن کاری کی رعنائی محسوس ہو۔

رعنائی کا لفظ آتے ہی یہ بتا دینا ضروری ہے کہ شیریں زبان جس میں گھسے پٹے، بلکہ چکنے الفاظ معروف تراکیب میں مشاطگی سے سنوار کر شاعری میں اگر جمع کر بھی دیے جائیں تو کوئی فنی حسن پیدا نہیں ہوتا۔مرسل بہ کو صرف ایک چھوٹے سے پل کے لیے کچھ لذت ملے گی اور بس۔بیشتر شیریں لب ولہجہ اورد کی پیداوار ہوتا ہے وہیں ایک خاص نیم رومانی یا رومانی مزاج کی پیداوار بھی ہوسکتا ہے۔ اور یہ جذبہء ترسیل محبوبیت کے حرص کی وجہ سے پروان پاتا ہے۔اس لب و لہجے کا شائق شاعر بڑی افسانوی فضا پیدا کرتا ہے اور میٹھے زبان زد اور عجمیت زدہ عمومی الفاظ کو جوہری کی طرح جوڑتا ہے اور پھر فنکارانہ طور پر ایک نظم یا غزل یا شعر پیش کرتا ہے۔جو ایک جڑاؤ زیور کی طرح چمک دار ہوتا ہے/ ہوتی ہے۔حاصل صرف ایک عیش پسندانہ فکر ہے۔خوب صورت، خوش نما، سجاوٹ سے آراستہ اور دل فریب تراکیب عمدہ فکر، مرتکز اظہار و مناسب تناؤ کا بدل نہیں بلکہ غیر ضروری مصنوعیت اور لفاظی اصل کرب یا نشاط یا تصور کے ابلاغ میں حارج ہوجاتی ہے۔دکھ بھری بات کا اظہار کچھ اس طرح ہوجاتا ہے کہ لفظی رعنائی درد کی چبھن کو محسوس نہیں ہونے دیتی۔بعض اوقات شیریں تخلیقات مشاعراتی اور محفلی فضا میں ناموری کی سوغاتیں بھی حاصل کر لیتی ہیں۔شعراء جن کا مطالعہ مختلف موضوعات پر وسیع ہے اور لغت دانی میں بھی مہارت رکھتے ہیں، کئی بار لفظ پرستی اور دقت نگاری میں مشغول ہوجاتے ہیں بلکہ تعقل پسندی، تعقید اور اِرادی اِبہام کے شوقین ہوجاتے ہیں۔یہاں پر چند اہم نکات قابل بحث اور اہم ہیں:

- شاعری کی زبان معیاری ہو، تلفظ، املا، بحر و وزن کا اہتمام لازم ہے
- شاعری میں شاعر کے خالص جذبات کا اظہار ہو، بناوٹ اور نقالی سے پرہیز کیا جائے
- کلام میں تازگی، جدت، ایجاد اور ندرت، اور ضرور ہو۔
- روندے ہوئے، مدقوق، اور گردالود انداز سے حتی المقدور احتیاط برتا جائے
- تجربہ کے نام پر بے تکے اور بدرنگ کلام سے احتراز کیا، گرچیکہ وقتی طور پر سستی شہرت کا امکان ہی کیوں نہ ہو، خرافات، اول فول باتوں سے، عوام کا دل بہلانے کیلئے نچلی سطح پر اترنے سے بچا جائے۔

• موضوعاتی شاعری رہ رہ کر سمت نہ بدلے اور عنوان کی وفادار رہے!

• شاعری میں شاعرانہ پن ہو، نثری بیان، کھردرا پن اور تک بندی نہ ہو، کامل شعر وہی ہے جس میں موزونیت بھی ہو، اثر بی ہو۔

• شاعر کو فن شعر میں مہارت کے لئے عروض، بحور واوزان، سخن کی صنعتوں، عیوب، حسن وقبح اور شعرا کے کلام کے مطالعہ اور فنی علم کا حصول بہت مفید ہے، گرچیکہ شاعر کی فنکارانہ حس اس ضمن میں بنیاد کا رول ادا کرتی ہے۔

• تنگ عروض کی مجبوریاں اور سانچے کچھ ایسی صورت حال پیدا کر دیتی ہیں، کہ شعر سانچے میں ڈھلی ہوئی شئے تو بن جاتا ہے، فن پارہ نہیں ہو پاتا۔

• ارادی طور پر لسانی تجربے بیشتر عجیب وغریب بن جاتے ہیں، بدرنگ اور بدمزہ۔ ہندی، پنجابی، انگریزی، فارسی اور عربی کے غیر متناسب اور بے جا طور سے شاعری میں داخل کرنے سے فی الاصل زبان میں کوئی حسن نہیں پیدا ہوتا۔ اور عموماً ابہام اور نارسا ترسیل کی صورتحال سامنے اجاتی ہے۔ اس موقع پر کچھ کامیاب شعری کاوشوں کا بھی ذکر ہو جائے، تو مناسب ہوگا۔ مثال کے طور پر:

☆ غزلیہ کلام:

اک عمر ہوئی جس میں خسارے سے لگا ہوں
پکڑا ہے وہی کام دوبارے سے لگا ہوں

کون سے عکس عجب کا منتظر ہوں صبح سے
راہ پر بیٹھا ہوں آئینہ ہے چکا یا ہوا

خزاں کی شام تھی یا عکسِ نو بہار کوئی
کہ ابر شاخِ ہوا پر کھلا گلاب ایسا ۔ ظفر اقبال

رہتا تھا سامنے ترا چہرہ کھلا ہوا
پڑھتا تھا میں کتاب یہی ہر کلاس میں

اک کرن تھام کے میں دھوپ نگر تک پہنچا
کون سا عرش ہے جس کا کوئی زینہ ہی نہیں

خلش غم سے مری جاں پہ بنی ہے، جیسے
ریشمی شال کو کانٹوں پہ کوئی پھیلا دے۔ شکیب جلالی

کیسا اتھاہ سمندر تھا وہ خیالوں کا
موجیں کتنا شور مچانے والی تھیں

کیا کوئی درد دل کے مقابل نہیں رہا
یا ایک دل بھی درد کے قابل نہیں رہا

اپنی تلاش ہے ہمیں انکھوں کے شہر میں
ائینہ جب سے اپنے مقابل نہیں رہا۔ مغنی تبسم

بنا حسنِ تکلم حسنِ ظن آہستہ آہستہ
بہر صورت کھلا وہ کم سخن آہستہ آہستہ

دامن ہے دور اور گلے نارسا کے ہیں
گویا ہمارے ہاتھ فقط اب دعا کے ہیں

کیا یہ دنیا مرے ہاتھوں سے نکل جائے گی
دشت کوتاہ تری بے خبری کیسی ہے ۔ شاذ تمکنت

ہر صبح میں پتھر کی طرح سخت بنا ہوں ہر شام میں شیشے کی طرح ٹوٹ گیا ہوں
میرا وجود جذب ہوا تیرے جسم میں اب مجھ کو اپنے جسم کے اندر تلاش کر
جیسے خدا زمیں پہ نہیں آسماں پہ ہے کچھ یوں دعا کو ہاتھ اٹھاتا ہوں رات بھر۔علی الدین نوید

☆ نظموں سے اقتباسات

ا۔ پختہ افکار کہاں ڈھونڈنے جائے کوئی/ اس زمانے کی ہوا رکھتی ہے ہر چیز کو خام/ مدرسہ عقل کو آزاد/ تو کرتا ہے مگر/ چھوڑ جاتا ہے خیالات/ کو بے ربط و دوام/ مردہ، لادینی افکار سے افرنگ میں عشق/ عقل بے ربطئی افکار سے مغرب میں غلام۔اقبال (عصر حاضر)

۲۔ سوکھے ہوئے پتوں سے میرے/ ہنسنے کی صدائیں آئیں گی دھرتی کی سنہری سب ندیاں/ آکاش کی نیلی سب جھیلیں/ ہستی سے مری بھر جائیں گی/ اور سارا زمانہ دیکھے گا/ ہر قصہ مرا افسانہ ہے/ ہر عاشق ہے سردار یہاں ہر معشوقہ سلطانہ ہے!۔علی سردار جعفری (میرا سفر)

۳۔ دسمبر چیختا ہے جب رگوں میں/ لطف سے عاری پریشاں محفلوں میں/ مجھکو وہ بدنام دشمن یاد آتا ہے/ جو میرے خون کا پیاسا گلی سے جب گذرتا تھا/ مرے اعصاب میں اک سنسنی سی دوڑ جاتی تھی!
میں اس لمحے کی برہم آگ میں جلتا ہوا۔۔محسوس کرتا تھا/ میں زندہ ہوں۔۔۔مسلسل ہوں/ میں زندہ ہوں۔۔۔مسلسل ہوں۔بلراج کومل (دسمبر کی آواز)

۴۔ ستّر سال بہت ہوتے ہیں کون جیے، ستّر صدیوں تک/ اپنے ہی کاندھوں پہ اٹھائے/ اپنا لاشہ/ کون پھرے ستّر لمحوں تک/ ستّر سال بہت ہوتے ہیں!/ سلیمان اریب (ماں کے انتقال پر۔۔)

۵۔ اور سنہری دھانی نقطوں والی دھرتی ابھری پاٹ گئی تاریک ڈھلانوں کو/ سارے نشیب ہیں قد آدم، اونچے بنفشوں میں ڈوبے/ بسراوے کی نرل جوئے شیر سی چمکیلی دھارا بہتی ہے/ اور بہار آئی.....!!شفیق فاطمہ شعری (رُت مالا)

۶۔ میرے لئے رات نے/ ہے فراہم کیا۔۔/ اک نیا مرحلہ/ ۔۔۔۔نیندوں سے خالی/ اشکوں سے پھر بھر دیا/ کاسہ مری انکھ کا/ اور کہا کان میں/ میں نے ہر جرم سے/ تم کو/ بری کر دیا/
شہریار (خواب کا در بند ہے!)

۷۔ وہ مجھ سے کہتی ہیں/ تم بھی تو روز اپنے بدن کے فولاد/ دل کے شیشے کو یوں ہی بھٹی میں جھونکتے ہو/ تو دیکھ لو/ / رات رات، دن دن، گھڑی گھڑی، لمحہ لمحہ/ مری طرح تم بھی مر رہے ہو/ (مری طرح سب ہی مَر رہے ہیں)/ مگر نگاہیں بچائے رکھنا۔ عزیز قیسی (یکش نگری، 20)

شاعری کا سرچشمہ شاعر کی مخصوص ذہانت اور عبقریت میں کہیں مضمر ہے۔ کامیاب شعراء خوب جانتے ہیں کہ الفاظ بڑے بیش قیمت مہرے ہیں اور ان سے خوب کھیل کھیلا جا سکتا ہے۔۔ اور اِس کھیل کو وہ مشاقی کے ساتھ کھیلتے ہیں مثلاً ترتیب کے ردوبدل سے جو ترکیبی اشکال وقوع پذیر ہوتی ہیں شاعری میں (اگر شاعر چابکدست ہو تو) کافی کامیابی کے ساتھ اِستعمال کی جا سکتی ہیں۔ غیر عمومی الفاظ اور نادر تراکیب کا استعمال شاعری میں ایک جداگانہ شناخت کے لئے اکثر کامیاب ہوتا ہے۔ لیکن کبھی کبھی غیر شاعرانہ الفاظ اور تراکیب بے حد کھردرے اور نارسا ہو جاتے ہیں اور قاری سامع کی پسند کو مائل نہیں کرتے۔ لیکن کبھی کبھی شاعر کی عبقری صلاحیت اور فنی مہارت نے ان ہی میں حسن پیدا کر دیتی ہے اور وہی الفاظ انوکھے لگنے لگتے ہیں۔ یعنی فن کار کی ذاتی صلاحیت کا رول نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔

جب شاعر کوئی قابلِ اظہار و مائل بہ اعلان فکری نکتہ یا تخلیق کی صورت گری کر لیتا ہے تو اس کے دل میں اظہار کا جذبہ موجیں مارنے لگتا ہے، بلکہ ہم نے تو یہ بھی دیکھا ہے تک بندی کرنے والے متشاعر تو اور زور شور سے، 'عرض کیا ہے' کی تکرار کرتے نظر آتے ہیں۔ میں نے یہ بھی دیکھا ہے کہ کچھ لوگ اپنی تخلیق کی نوک پلک درست کئے بغیر اور فنی نگاہ سے نظر ثانی کئے بغیر دھوم دھام سے محفلوں میں اپنا کلام پیش کرتے رہتے ہیں۔ خراب تلفظ، املا میں اغلاط، موزونیت میں عیب یہ سب شاعری کو برباد کر کے رکھ دیتی ہیں۔ مشاعرہ پسند شعرا کا اپنا ہے راستہ ہے، ان کا ایمان کامل ہے کہ وہی شاعر کامیاب اور ممتاز ہے جو مشاعروں میں داد اور ستائش سے مالا مال ہو۔ یہ شاعر معاوضے اور درجہ بندی کے شائق ہوتے ہیں۔ میں نے مشاعروں میں کامیابی کے لئے کئی ایسے شاعروں کو دادِ لحن حاصل کرتے ہوئے معروف راگ و راگنی پر مبنی کلام پڑھتے ہوئے، لطیفہ گوئی، مزاحیہ انداز، نوک جھونک کر کے محفل میں دل چسپی پیدا کرتے ہوئے دیکھا ہے۔

بعض شعرا حمد و نعت کی جانب مائل رہتے ہیں محفلوں میں اول بلکہ دو تین بار سنانے کا موقع ہاتھ آتا ہے۔ کئی شاعر ایسے ہیں جو با قاعدہ ردیف قافیہ کے میدان کو دنگل بنا دیتے ہیں۔ کچھ وہ بھی ہیں جو قوم پرستی یا علم بغاوت اور صدائے انقلاب کے حربے شہرت کے ہتھیار کی طور پر پسند کرتے ہیں۔ ایسے کئی غیر ادبی معیارات ہیں جو سکہ رائج الوقت ہیں۔ یہی عوامی تماشہ پسند محفلوں میں عمدہ سے عمدہ ادبی شاعر ناکام رہ جاتا ہے کہ وہ طلبیدہ اور عامیانہ طرز شعر سے میل نہیں کھا پاتا۔ اچھے شاعر کی شاعری کی زیریں رو اُس کی تخلیقی فکر کو جھٹلاتی نہیں۔ اس بات کو ہم صدقِ دل سے مانتے کہ شاعری کی

زندگی خلوص اِظہار سے معنون ہے۔اورفن کوئی نعرہ نہیں ہے، یہ تو آمد ہی آمد ہے۔آوردتو مخلوق کلام ہی میں ملتی ہے۔اگر شاعر خام کار ہوتو بھونڈا پن ہی ناتج ہوتا ہے۔شاعری کی سب سے صحیح شکل وہ کلام ہے جو حادثاتی طور پر ایک عبقری صلاحیت والے ذہن پر الہام ہوجائے۔

یہ تو ایک جانی مانی حقیقت ہے کہ ایک کامیاب فن پارہ ایک اچھی شعری صلاحیت کا نتیجہ ہے۔ایک اچھی شعری صلاحیت ٹھوس اور کرخت واسطوں کو سہل تر کردیتی ہے۔غیر شاعرانہ الفاظ اور اسماء کچھ اس طرح کھنکنے اور چمکنے لگتے ہیں کہ ان ہی الفاظ کی معنویت اور ماہیت اپنے مردہ تنوں سے باہر نکل آتی ہے۔جیسے گرتی ہوئی دیوار پر ایک خوش نما پھولوں کی بیل اُگ آئے۔اور اس طرح ایک کامیاب فن پارہ اپنے ہر جزو کو اپنی اجتماعی کیفیت میں لے لیتا ہے۔

بلاشبہ، روز ازل سے اج تک ہر شاعر کامیاب شاعری کی تلاش میں فن کے بحر و بر میں سرگرداں ہے۔

☆☆☆

Nargis ki Aakhri Gawahi by Dr.Guljabeen Akhtar Ansari (Assot. Prof. deptt. of Urdu, Lal Bahadur Shastri PG College Mughal Sarai Chandauli) cell- 9450907747

ڈاکٹر گل جبین اختر انصاری (ایسوسی ائٹ پروفیسر، شعبہ اردو، لال بہادر شاستری پی جی کالج، چندولی)

نرگس کی آخری گواہی

کشمیری لال ذاکر نے اپنے خاکوں کے مجموعے یاران تیز گام میں آخری گواہی کے عنوان سے نرگس کا خاکہ قلمبند کیا ہے۔ نرگس کا اردو سے ایک خاص رشتہ رہا ہے۔ منٹو نے بھی اپنے خاکوں کے مجموعے گنجے فرشتے میں نرگس کا ایک سوانحی خاکہ شامل کیا ہے جس میں انھوں نے نرگس کی زندگی کے بہت سے ان دیکھے اور ان چھوئے پہلوؤں پر روشنی ڈالی ہے۔ دبلی پتلی چھوئی موئی سی نرگس کو ایک بڑی اداکارہ نرگس بنتے ہوئے دکھایا ہے۔ نرگس سے منٹو کی پہلی ملاقات اس وقت ہوئی جب گیارہ سال کی معصوم اور کمزور سی دکھنے والی نرگس اپنی ماں کی انگلی پکڑ کر فلموں کی نمائش کے موقع پر آتی تھی جس کا ذکر منٹو نے اس طرح کیا ہے،

"نرگس کو میں نے ایک مدت کے بعد دیکھا تھا۔ دس۔ گیارہ برس کی بچی تھی جب میں نے ایک دو مرتبہ فلموں کی نمائش عظمہ میں اسے اپنی ماں کی انگلی کے ساتھ لپٹی دیکھا تھا۔ چندھیائی ہوئی آنکھیں، بے کشش سا لمبوترا چہرا، سوکھی سوکھی ٹانگیں ایسا معلوم ہوتا تھا سوکر اٹھی ہے یا سونے والی ہے مگر آنکھیں ویسی کہ ویسی تھیں چھوٹی اور خواب زدہ۔۔۔۔۔۔ بیمار بیمار۔۔۔۔ میں نے سوچا اس ریایت سے اسکا نام نرگس موضوع اور مناسب ہے۔"ا

دکھنے میں بیمار خواب زدہ آنکھوں اور بے کشش چہرے والی نرگس کی طبیعت میں میں کھلڈرپن تھا، بار بار ناک صاف کرتی مانو ازلی زکام کا شکار ہو، ایسی نرگس کے اندر بلا کی سنجیدگی اور خیالات میں گہرائی تھی جو ایک عظیم فنکار کے کردار کا جوہر ہوتی ہے۔ تھوڑی سی بناوٹ اور اس میں خوبصورت ادائیگی کا بہترین سنگم تھیں۔ نرگس کو اس بات کا شروع سے ہی احساس تھا کہ مستقبل اسے

ایک بڑی اداکارہ کے روپ میں بنتے دیکھے گا اور تاریخ اسے عظیم شخصیت کے طور پر یاد رکھے گی مگر اس کو اس بات کی نہ تو کوئی جلدی تھی اور نہ ہی کسی قسم کا کوئی غرور، نرگس تو اپنی زندگی کا ہر پل کھل کر گزارنا چاہتی تھیں۔ منٹو سے نرگس کی دوسری ملاقت بہت ہی دلچسپ اور تجسس آمیز تھی، منٹو لکھتے ہیں کہ جن دنوں وہ فلمستان میں ملازم تھے اور گھر اکثر دیر سے آتے تھے اس دن کام کم ہونے کی وجہ سے وقت سے پہلے گھر پہنچ گئے جہاں کا نظارہ عام دنوں سے بالکل الگ تھا، منٹو کو دیکھ کر انکی بیوی اور سالیاں اس طرح خاموش ہوگئیں جیسے کسی ساز کے تار کو چھیڑ کر کہیں چھپ گئیں ہوں ایسا اس لئے تھا کہ منٹو نے اس طرح خلاف توقع پہنچ کر نہ صرف انکے کسی خاص پروگرام میں خلل ڈال دی تھی بلکہ انکا راز بھی فاش ہونے والا تھا۔ دراصل آج نرگس انکے گھر آنے والی تھیں مگر انکی دوستی اس مقام تک کیسے پہنچی کہ آج اداکارہ نرگس انکے گھر آرہی تھیں یہ سوال منٹو کے لئے چونکا دینے والا تھا۔

ان کی بیوی اور سالیوں سے نرگس کا یہ تعلق بھی کم پراسرار نہیں تھا۔ منٹو نے لکھا ہے کہ کس طرح انکی غیر موجودگی میں انکی سالیاں جو کہ آدھی گھر والیاں ہوتی ہیں پھر یہاں تو دو تھیں تو اس لحاظ سے پورا گھر ان ہی کا تھا، وقت گزاری کے لئے ٹیلی فون کا استعمال فراخ دلی سے کرتی تھیں اور جب کوئی نہیں ملتا تو رانگ نمبر گھما کر سامنے والے کو اپنی باتوں سے گھماتی تھیں۔ اس سلسلے میں ایک بار نمبر دا اداکارہ نرگس کو لگ گیا اور بات چیت کا سلسلہ چل پڑا۔ شروع شروع میں یہ تینوں خواتین اپنی پہچان چھپا کر بات کرتیں، کبھی گجراتی تو کبھی پارسی بنتیں اور کبھی خود کو راولپنڈی کا بتاتیں مگر کیونکہ نرگس کی دلچسپی ان تینوں خواتین میں اس حد تک بڑھ گئی تھے کہ وہ انکے فون کا بے صبری سے انتظار کرنے لگی تھیں اور اب وہ انکی صحی پہچان ان سے مل کر جاننے پر آمادہ تھیں لہذا سلسلہء بات چیت سلسلہء ملاقات میں تبدیل ہونا طے ہوا تھا مگر منٹو نے وقت سے پہلے پہنچ کر انکے طے شدہ پروگرام میں وقتی رکاوٹ ڈال دی تھی، ایک ڈر بھی تھا کہ منٹو کہیں ناراض نہ ہوجائیں مگر منٹو لکھتے ہیں کہ انکی ناراضگی کا کوئی جواز بنتا نہیں تھا اس لئے نرگس کو گھر تک پہنچانے کی ذمہ داری منٹو کو دی گئی جو راستہ بھٹک گئی تھیں۔

اس طرح نرگس سے اپنی دوسری ملاقات کا ذکر منٹو نے ڈرامائی انداز میں کیا ہے جو بہت پر لطف بھی ہے۔ گیارہ سال پہلے والی اور آج کی نرگس میں بہت فرق تھا، ملاقات کے دوران انکی ماں جدن بائی ملک کی الگ الگ ریاستوں کا ذکر کرتی رہیں، اس متعلق انکی معلومات زیادہ تھی مگر نرگس پورے وقت انکی سالیوں کے ساتھ الگ کمرے میں الگ ہی موضوعات پر باتیں کرتی رہیں جہاں وہ محض ایک عورت تھیں نہ کہ ایک اداکارہ، جو روز الگ الگ کردار میں الگ الگ مردوں کے ساتھ عشق

لڑاتی نظر آتی ہیں، یہاں انکی بات چیت کا موضوع انکا گھر، انکے شوق اور کانونٹ تک ہی محدود تھا جہاں فلمی دنیا کا کوئی دخل نہیں تھا۔

"ادھر ادھر کی باتوں کے بعد نرگس سے فرمائش کی گی کہ وہ گانا سنائیں۔نرگس نے بڑی ہی معصومانہ بے تکلفی سے گانہ شروع کر دیا۔ پرلے درجے کی کن سری تھی، آواز میں رس نہ لوچ۔میری چھوٹی سالی اس سے لاکھوں بہتر گاتی تھی مگر فرمائش کی گئی تھی وہ بھی بڑی پر اسرار اس لئے دو تین منٹ تک اس کا گانہ برداشت کرنا ہو پڑا جب اس نے ختم کیا تو سب نے تعریف کی میں اور آپا سعادت خاموش رہے تھوڑی دیر کے بعد جدن بائی نے رخصت چاہی ،لڑکیاں نرگس سے گلے ملیں دوبارہ ملنے کے وعدے وعید ہوئے، کچھ کھسر پسر بھی ہوئی اور ہمارے مہمان چلے گئے، نرگس سے یہ میری پہلی ملاقات تھی"۔۲

اس دور میں فلموں میں کام کرنا اچھا نہیں مانا جاتا تھا اور منٹو کی بیوی کے خیالات بھی فلمی دنیا اور اس سے منسلک لوگوں کے بارے میں اس سے کچھ الگ نہیں تھے مگر صرف نرگس سے ملنے سے پہلے تک، نرگس سے ملنے کے بعد انکے خیالات نرگس کے تئیں بہت بدل گئے، انکی نگاہ میں نرگس پہلے محض ایک اداکارہ تھیں جنکا کام اپنی ادائیں دکھا کر لوگوں کا من بہلانا تھا اور اپنے کردار سے لوگوں کے جذباتوں کو متحیر کرنا تھا مگر نرگس سے ملنے پر انکے ساتھ انکا سلوک ایک دوست یا ایک بڑی بہن جیسا ہو گیا تھا، جسے وہ طرح طرح کے مشورے دیتی نظر آئیں مثلاً انھیں کیا کھانہ چاہئے اور کس سے پرہیز کرنا چاہیے وغیرہ وغیرہ۔اسکے بعد ملاقاتوں کا سلسلہ چل نکلا، نرگس کا جب بھی دل چاہتا وہ منٹو کی بیوی اور سالیوں سے ملنے چلی آتیں، ان ملاقاتوں میں جو بات منٹو کے لئے قابل غور تھی وہ یہ کہ نرگس جب بھی ملتی ایک عام گھریلو عورت کی طرح جن میں خود کے اسٹار ہونے کا ذرا بھی نہ دکھاوا تھا اور نہ گھمنڈ۔وہ ان لوگوں سے اس طرح ملتیں جیسے بہت پرانی سہیلیاں ہوں۔

منٹو کے خیال سے نرگس شروعاتی فلموں میں اداکاری کے جوہر سے نا آشنا تھیں، عشق کی ریس اور اسکول جانے کی ریس میں ہوئی تھکان میں انھیں فرق بعد میں معلوم ہوا، نرگس ایک لمبی ریس کا گھوڑا ثابت ہوئیں اس لئے انکی ماں جدن بائی نے اپنے دونوں بیٹوں کے مقابلے اپنی بیٹی کی پرورش پر زیادہ توجہ دی اور کانچ کے چھوٹے اور نازک ریزوں کو جوڑ کر ایک نایاب ہیرا تراش کر فلمی دنیا کو دیا اور اس طرح اپنا ادھورا خواب بھی پورا کیا۔

"نرگس کی اداکاری کے متعلق میرا خیال بالکل مختلف تھا۔ وہ قطعئی طور پر جذبات و احساسات کی صحی

عکاسی نہیں کرتی تھی، محبت کی نبض کس طرح چلتی ہے یہ اناڑی انگلیاں کیسے محسوس کرسکتی تھیں۔عشق کی دوڑ میں تھک کر ہانپنا اور اسکول کی دوڑ میں تھک کر سانس پھول جانا دومختلف چیزیں ہیں، میرا خیال ہے خود نرگس بھی اس کے فرق سے آگاہ نہیں تھی اس کے شروع شروع کی فلموں میں چنانچہ دقیقہ رس نگاہیں فوراً معلوم کرسکتی ہیں کہ اس کی اداکاری یکسر فریب کاری سے معرا تھی۔"۳

نرگس کی ہر ادا میں معصومیت تھی، جس دور میں فلموں میں کام کرنا معیوب سمجھا جاتا تھا انھوں نے اسے ایک پیشے کے طور پر منتخب کیا بلکہ فن اداکاری کو بلندیوں تک پہنچایا، اس سلسلے میں منٹو لکھتے ہیں۔

"نرگس کو بہرحال ایکٹریس بننا تھا بن گئی اس کے بام عروج تک پہنچنے کا راز جہاں تک میں سمجھتا ہوں اس کا خلوص ہے۔جو قدم بہ قدم، منزل بہ منزل اس کے ساتھ رہا۔"۴

فلمی دنیا میں اتنی شہرت، عزت اور بلندیاں حاصل کرنے کے بعد بھی نرگس میں ایک خالی پن تھا، زیادہ تر باتوں کا جواب وہ لفظوں کے بجائے مسکرا کر دینا پسند کرتی تھیں۔منٹو نے لکھا ہے کہ انکی بیوی بتاتی ہیں کہ حقیقت میں نرگس کی ہر بات میں الہڑ پن تھا، مگر وہ شوخی تیزی اور طراری اور تیکھا پن نہیں تھا جو پردے پر دکھتا تھا۔ایک طرف تو وہ بہت ہی گھریلو قسم کی عورت تھی مگر اس الہڑ پنے کے پیچھے ایک اداسی چھپی رہتی تھی، آنکھوں میں ایک عجیب قسم کی بے رونقی کا سایہ تیرتا رہتا تھا۔ایک جگہ منٹو لکھتے ہیں۔

"یہ قطعی طور پر طے تھا کہ شہرت کی جس منزل پر نرگس کو پہنچنا تھا وہ کچھ زیادہ دور نہیں۔تقدیر اپنا فیصلہ اسکے حق میں کر کے تمام متعلقہ کاغذات اس کے حوالے کر چکی تھی لیکن پھر وہ کیوں مغموم تھی۔کیا غیر شعوری طور پر وہ یہ محسوس تو نہیں کر رہی تھی کہ عشق ومحبت کا یہ مصنوعی کھیل کھیلتے کھیلتے ایک دن وہ کسی ایسے لق ودق صحرا میں نکل جائیگی جہاں سراسر ہی سراب ہوں گے پیاس سے اس کا حلق سوکھ رہا ہوگا اور آسمان پر چھوٹی چھوٹی بدلیوں کے تھنوں میں صرف اس لئے دودھ نہیں اترے گا کہ وہ خیال کریں گے کہ نرگس کی پیاس محض بناوٹ ہے زمین کی کوکھ میں پانی کی بوندیں اور زیادہ اندر کو سمٹ جائیں گی اس خیال سے کہ اسکی پیاس صرف ایک دکھاوا ہے۔"۵

اس کے بعد کے اس درد کو کشمیری لال ذاکر نے اپنے خاکے میں یوں بیان کیا ہے۔

"بریچ کینڈی اسپتال میں زندگی اور موت کی جنگ میں ہمت اور دلیری سے لڑتی ہوئی بھابی دھیرے دھیرے زندگی کے محاذ سے پیچھے ہٹ رہی تھیں، یہ، بر بھی مجھے برابر مل رہی تھی۔میں نے بھابی کی ایک مختصر سی سطر اور اسکے دستخط بھی پڑھے تھے۔ایک انگریزی اخبار کے پہلے صفحہ پر اس نے سائیں بابا کو

مخاطب کیا تھا، 'بابا مجھ سے یہ عذاب نہیں سہا جاتا' نرگس۔"٦

ذاکر لکھتے ہیں کہ ان کے خاندان میں دو ہی عورتیں ایسی تھیں جن کے نقش اور ہنسی نے انھیں متاثر کیا تھا ایک انکی ماں اور ایک انکی بوا۔ اس پرانی پیڑھی میں نئی پیڑھی کی جس خاتون کی آمد سے چار چاند لگ گئے وہ نرگس تھے، جنکی بے ساختہ کھلکھلاہٹ نے انھیں بہت متاثر کیا تھا۔ ایک مسلم گھر میں پلی بڑھی نرگس نے ایک برہمن خاندان میں آکر جس طرح رچ بس گئیں وہ لائق دید تھا۔ وہ نرگس جس نے اپنے لیٹر ہیڈ پر مسز نرگس سنیل دت چھپوا کر رکھا تھا ایک ایسے خاندان سے جڑ چکی تھیں جو موہیال برہمنوں کا خاندان تھا جہاں کے لوگ اکثر فوج میں ملتے ہیں یا پولس میں۔ فنکاری اور پڑھائی لکھائی سے انکا تعلق کم رہا ہے، ایسے خاندان سے نرگس کسی ڈار سے بچھڑے جیو کی طرح آکر مل گئی تھی۔ یہ شاید انکے پچھلے جنم کے سنسکار رہتے۔ کیونکہ جب سنیل دت کی ماں کی موت واقع ہوئی تو اس وقت جو درد سنیل کے دل میں تھا وہی درد نرگس ی آنکھوں سے بھی چھلک رہا تھا۔

"سنیل ننگے پاؤں واپس گھر پہنچا۔ اسکے پاؤں میں دریا کے کنارے پراگی جھاڑیوں کے کانٹے ٹوٹ گئے تھے، جنکی کسک تو شائد دوسرے بھی محسوس کر سکتے تھے لیکن جو کانٹا اسکی روح میں چبھ گیا تھا وہ کسی کو نظر نہیں آرہا تھا، اس ٹوٹے ہوئے کانٹے پر نگاہ تھی صرف نرگس بھابی کی۔ کانٹا صرف سنیل کی روح میں ہی نہیں اس کی روح میں بھی تو چبھ کر ٹوٹا تھا۔ خون کے آنسو صرف سنیل ہی نہیں بہا رہا تھا نرگس بھی تو بہا رہی تھی۔"٧

جس دوران نرگس اپنے علاج کے سلسلے میں امریکہ میں تھیں اور جس درد سے وہ دوچار تھیں اس وقت وہ اکیلی اس درد کا شکار نہیں تھیں انکے درد میں سنیل پوری طرح شریک تھے۔ ایک برس سے زیادہ کا عرصہ سنیل دت نے ایک ذہنی درد قرب میں گزارا تھا۔ اور وہ اس پورے دور کو ایک تخلیقی شکل دے کر پردے پر لانا چاہتے تھے اور اس سے ہونے والی پوری آمدنی کو وہ ایک ضرورت مند سوسائٹی میں خیرات کرنا چاہتے تھے۔ سنیل دت نے بتایا کہ امریکہ سے علاج کرا کر واپس آنے کے بعد نرگس میڈم اندرا گاندھی سے بات کرنا چاہتی ہیں کہ ہندستان میں بھی جدید ترین ساز وسامان اور تمام طرح کے ماڈرن آلات سے لیس ایک کینسر اسپتال قائم کریں، کیونکہ ایک عام ہندستانی کینسر کے مریض کو وہ تمام سہولتیں میسر نہیں ہو پاتی جو اسے ملنی چاہئے۔ مگر ایسا ہو نہ سکا، نرگس میڈم اندرا گاندھی سے بات کرنے کے لئے کبھی ہندستان واپس نہ آسکیں۔

"دل و ماغ پر ایک قیامت ٹوٹ پڑتی ہے، ایک زلزلہ جاگ اٹھتا ہے اور ایک اور ارتھی اٹھتی ہے جسے

کوئی نہیں دیکھتا کیونکہ وہ دل کے نہا خانوں میں جلتی ہے اور لکڑیوں کی جگہ جذبات سلگتے ہیں اور احساس جلتا ہے اور بھاؤ نائیں جلتی ہیں اور جب گرم گرم راکھ ہوا کے کسی جھونکے کے کارن چتا کے گہرے دھوئیں سے الگ ہو کر آنکھوں کے پپوٹیوں پر جم جاتی ہے اور سلگتی ہے تو جب ہی درد کا رشتہ مضبوط ہوتا ہی۔۔۔۔۔۔۔۔اور یہ میری آخری گواہی ہے خاموش اور بے زبان گواہی جو کسی عدالت میں پیش نہیں ہوگی کہ درد کی کوئی عدالت نہیں ہوتی۔"۸

مگر ہاں ان کی فلم کا پریمیر بھی ہوگا اور سنیل سب سے اس متعلق بات بھی کریں گے اور انکی تعریفیں بھی سنیں گے، سب سے مسکرا کر ملیں گے بھی مگر جو کانٹا اسکی روح کو چبھا ہوگا اسے نکالنے والا کوئی نہ ہوگا۔

حواشی

۱۔گنجے فرشتے۔سعادت حسن منٹو، ساقی بک ڈپو دہلی، جدید اڈیشن ۱۹۸۳: صفحہ ۲۴۹

۲۔ایضا۔صفحہ ۲۵۲۔۲۵۳ 3۔صفحہ ۴۲۵۴۔صفحہ ۲۵۶ 5۔صفحہ ۲۵۸

۶۔یاران تیز گام خاکے۔از کشمیری لال ذاکر۔اجوکیشنل پبلشنگ ہاوس دہلی۔صفحہ ۴۵

۷۔صفحہ ۴۸۔۴۹ 8۔صفحہ ۵۲۔۵۳

☆☆☆

Shamshad Shaad ki Shairi ka tanqidi-o-tajziyati mutalea by Wafa Naqvi (Aligarh) cell-9219782014

وفا نقوی (علی گڑھ)

شمشاد شادؔ کی شاعری کا تنقیدی و تجزیاتی مطالعہ

شمشاد شادؔ کا تعلق مہاراشٹر کے علمی و ادبی شہر ناگپور سے ہے۔انھوں نے بہت کم عرصے میں نئی شاعری کے حوالے سے اپنی ایک شناخت قائم کی ہے۔ان کی شاعری روایت و جدیدیت کے امتزاج واختلاط کا حسین مرقع نظر آتی ہے۔جس کے ثبوت میں ان کے مجموعۂ کلام 'حرفِ اثبات' کو پیش کیا جاسکتا ہے۔وہ ایک ایسے شاعر ہیں جن کے یہاں مختلف اسالیب کی کارفرمائی نظر آتی ہے۔وہ بیک وقت ایک مبصر،مبلغ،عشقِ مجازی و حقیقی کے متحمل، جہاں دیدہ،دور بین،حق شناس اور پیامبرِ انسانیت بھی نظر آتے ہیں۔ان کی شاعری میں در آئے مضامین و الفاظ اپنے حسن کا پورا جادو بکھیرتے ہوئے نظر آتے ہیں۔وہ جہاں اس حوالے سے اہلِ نقد ونظر کو متاثر کرتے ہیں وہیں عام قارئین کو بھی محروم نہیں کرتے بلکہ ہر مزاج وخیال اور مختلف علمی صلاحیتوں اور افکار کے افراد ان کی شاعری سے محظوظ ہوئے بغیر نہیں رہتے۔خاص بات یہ ہے کہ وہ کہیں ادبی تقاضوں سے تہی دامن نہیں ہوتے۔ان کا مزاج حقیقی طور پر شاعرانہ ہے اور ان کی فکر بلند پرواز نظر آتی ہے۔وہ اس سلسلے سے نہ صرف بیابانوں،صحراؤں،دشت و دریا کی پیمائی کرتے ہیں بلکہ آسمانوں پر بھی کمند ڈالتے ہیں۔ان کے یہاں شاعری میں وہ تمام عناصر ولوازمات موجود ہیں جو انھیں منفرد اور بڑا شاعر بنانے کے لئے معاون ہیں۔اس مضمون میں ان کی شعری کاوشوں کا ایک تجزیاتی وتنقیدی جائزہ لینے کی کوشش کی گئی ہے تاکہ یہ ثابت کیا جاسکے کہ ایک شاعر کو عظمت و رفعت کے سلسلے سے کس کس راہ سے گزرنا پڑتا ہے۔

ایک منفرد اور دور اندیش شاعر کا اس کی شاعری کے متعلق خود اس کا ایک موقف اور ایک فلسفہ ہوتا ہے۔وہ دوسروں کے بنائے ہوئے اصلوں سے انحراف کرتے ہوئے اس سلسلے سے اپنے لئے خود اصول اختراع کرتا ہے۔شمشاد شادؔ بھی خود کی ایک منفرد فکر رکھتے ہیں۔وہ اپنے

لئے چند اصول وقوانین وضع کرتے ہیں اور شعر گوئی میں اس کا ہمیشہ پاس رکھتے ہیں۔مثلاً ان کا شعر ہے:

قنوط و یاس کی باتیں نہ ذکرِ خوف و ہراس　　مری غزل کا ہر اک لفظ ہے پیامِ حیات

یعنی وہ قنوط و یاس کے راستوں کے مسافر نہیں۔وہ شاعری کو رجائیت،نشاط وانبساط کا ایک ذریعہ سمجھتے ہیں تاکہ زندگی کی تلخیوں کے باعث مایوس نہ ہوا جائے بلکہ راہِ حیات کے مدو جزر کا مقابلہ حوصلے کے ساتھ کیا جائے۔عصرِ حاضر میں دیکھا جائے تو آج کی شاعری بھی محض نام کی یاسیت اور حزن و ملال سے خود کو بچانے کی کوشش کرتی ہے۔آج کے شاعر میں مایوسی نہیں بلکہ آلام ومصائب سے لڑنے کا ایک عزم اس کے یہاں ہمیشہ بیدار رہتا ہے۔اگر کسی کے یہاں غم و رنج والم کے مضامین بھی نظر آتے ہیں تو وہ ایسے نہیں کہ جن سے یہ ثابت ہو کہ شاعر ڈپریشن کا شکار ہے اور دنیا سے بددل ہو چکا ہے یا رونا پیٹنا اس کا شیوۂ کار ہے جس سے زمانہ اس پر ترس کھائے۔یعنی آج کا شاعر نئے زمانے میں بعینہ خود کو ڈھال چکا ہے اس کے ساتھ مسائل تو ہیں لیکن وہ ان مسائل سے گھبراتا نہیں بلکہ ان کا مضبوطی سے مقابلہ کرتا ہے اور دنیا کو بھی یہی پیغام دیتا ہے کہ مسائل سے قطعی نہ گھبرایا جائے۔شمشاد شاؔد بھی اسی فکر کے تحت اپنی شاعری کے چراغ روشن کرتے ہیں اور شعروسخن کے ذریعے حوصلے اور امید کی بات کرتے ہیں۔مثلاً:

ہوں میں پرامید اوجِ ارجمندی آئے گی　　میرے حصے میں بھی اک دن سربلندی آئے گی

وہ کسی طور زندگی کی صعوبتوں اور مشکلات میں حوصلہ نہیں ہارتے۔شعر ہے:

میں وہ چراغ ہوں جس میں ہے عزم کا ایندھن　　نہیں ہے خوف مجھے آندھیوں میں چلنے کا

وہ غم ورنج اور مصائب میں ایک دوسرے کا ساتھ نبھانے پر زور دیتے ہیں کیوں کہ ان کی نگاہ میں اتحاد ہی ہے جو انسان کا ہر مشکل میں دفاع کرسکتا ہے۔شعر ہے:

نہ سوچیں لوگ کہ ہم میں ہے اختلاف کوئی　　قریب آؤ قدم سے قدم ملا کے چلیں

گویا کہ وہ دوریوں کے قائل نہیں ساتھ ہی منافقت ان کی نگاہ میں نہایت برا عمل ہے۔کہتے ہیں:

پیٹھ سے ہرگز نہ کوئی وار ہونا چاہئے　　دشمنی کا بھی کوئی معیار ہونا چاہئے

یعنی وہ دشمنی میں بھی ایک معیار قائم رکھنا چاہتے ہیں۔ان کا خیال ہے کہ دشمن کو بھی دھوکا دینا جائز نہیں۔

وہ جہاں غم ورنج والم سے لڑنے کا پیغام دیتے ہیں اور دشمنی کے بھی اصول قائم کرتے ہیں وہیں اپنے معاشرے کی تصویر کو نہایت خوبصورت بنانے پر بھی زور دیتے ہیں کیوں کہ معاشرہ فرد سے وجود پاتا ہے اس لئے ان کا ماننا ہے کہ فرد اپنے آپ کو سدھارے اور اپنے وقت کی قیمت سمجھتے ہوئے اپنی اور اپنے معاشرے کی قدر ومنزلت میں اضافہ کرے۔شعر ہے:

وقت رہتے خود کو فائز کر مقامِ رشک پر پھر نہ کہنا زندگی کی شام ڈھلنے لگ گئی

معاشرے کے ساتھ ساتھ وہ گرد وپیش کے ماحول اور فضا پر غائر نگاہ رکھتے ہیں۔وہ سمجھتے ہیں کہ اپنے خوبصورت ماحول اور فضا کو بھی بچانا نہایت ضروری ہے اگر اس کے ساتھ تخریب کاری کا سلسلہ جاری رہا تو انسان کا وجود زمین پر دشواریوں کا شکار ہو کر رہ جائے گا۔شعر ہے:

پیڑ پودے جو یوں ہی کٹتے رہیں یہ زمیں بے شجر نہ ہو جائے

اس وضاحت کی ضرورت نہیں کہ یہ شعر کتنے معنی ومطالب کا مظہر ہے جہاں اس میں علامتوں کا التزام ہے وہیں اس میں سائنسی نکتے بھی بیان کئے گئے ہیں۔جن کا مقصد قدرت کی طرف سے عطا کی گئی نعمتوں کا تحفظ کرنا ہے۔وہ زندگی کو غور وفکر سے گزارنے کا پیغام دیتے ہیں اور دل پر عقل کو فوقیت دیتے ہیں۔کہتے ہیں:

ارادے عقل والوں کے بہت مضبوط ہوتے ہیں انہیں دل کی بغاوت کو کچلنا خوب آتا ہے

چونکہ وہ پیامبر کے ساتھ ساتھ ایک مبلغ بھی نظر آتے ہیں اس لئے اپنی بات کہنے میں ذرا جھجک محسوس نہیں کرتے وہ دل کے جذبات وخیالات کے نتیجے میں کئے گئے عمل کے انجام کی طرف بھی طبیعت مبزول کراتے ہیں۔کہتے ہیں:

اگر تو کام لیتا دور اندیشی سے تو اے دل تجھے زخمی نہ کر پاتے کبھی حالات کے پتھر

یعنی دور اندیشی سے کام نہ لینا انسان کو بہت سے حادثات اور سخت معاملات میں گرفتار کر دیتا ہے۔وہ چاہتے ہیں کہ عمل کرنے سے پہلے عمل کے نتائج پر غور کیا جائے۔شعر ہے:

اسی کو لوگ حماقت کا نام دیتے ہیں ہوڈوبنے کا گماں تو ندی میں جائیں کیوں

مگر وہ انسانی نفسیات سے بھی خوب واقف ہیں۔انھیں معلوم ہے کہ انسان جس سے محروم رہتا ہے اسے حاصل کرنے کی تمنا اس کے دل سے کبھی معدوم نہیں ہوتی۔وہ اپنی تمناؤں کے حصول کے لئے ہر ممکن کوشش کرتا ہے اور اس سے متعلق سینکڑوں خواب دیکھتا ہے لیکن جب حقیقت سامنے آتی ہے تو اس کے دامن میں کچھ باقی نہیں رہتا۔شعر ہے:

لطف آتا ہے مجھے راتوں کو جن خوابوں میں صبح ہوتے ہی وہی خواب ڈراتے ہیں مجھے

لیکن یہ بھی سچ ہے کہ بے حس انسان کا دل ہی تمناؤں اور آرزوؤں سے دور رہ سکتا ہے ایک فکر مند انسان ہمیشہ اپنے مقاصد کے لئے کوشاں رہتا ہے۔ کہتے ہیں:

جو لوگ ذی حس ہیں ان کے پیچھے ہی مسئلے ہیں
وہ چین سے ہیں جو آنکھ موندے پڑے ہوئے ہیں

ایک فکر مند انسان جس شئے کی فکر میں غلطاں رہتا ہے اور ہمہ وقت جس کے بارے میں سوچتا رہتا ہے اگر اس کا وجود بھی نہ ہو تو بھی وہ اسے اپنے آس پاس محسوس کرتا ہے۔ شعر ہے:

تیرا ہی جب خیال ہے آٹھوں پہر دماغ میں جاگتے سوتے ہر طرف تو ہی نظر نہ آئے کیوں

وہ اس نفسیات سے بھی بخوبی واقف ہیں کہ غلط فہمیاں اور بدگمانیاں انسان کی خوبیوں میں بھی خامیاں تلاش کر لیتی ہیں۔ کہتے ہیں:

دکھائی دے گی اسے کیا کسی میں اچھائی جو اپنے دل میں برائی چھپا کے بیٹھا ہے

ان کا ماننا ہے کہ سچ میں بہت طاقت ہوتی ہے چاہے جھوٹ بظاہر کتنا ہی سر بلند کیوں نہ ہو جائے وہ حق گوئی کے آگے ہیچ ہی نظر آتا ہے۔ کہتے ہیں:

باتوں میں اگر اپنی سچائی نہیں ہوتی بے چینی سے محفل میں پہلو نہ بدلتا وہ

ایک بڑے شاعر کے لئے حساس ہونا بہت ضروری ہے اگر ایسا نہ ہو تو اس کی شاعری کا کینوس وسیع نہیں ہو سکتا وہ جو کچھ معاشرے میں دیکھتا ہے اسے لگتا ہے کہ وہ سب کچھ اس کے ساتھ ہو رہا ہے۔ وہ مصلحت شناس تو ہو سکتا ہے لیکن حقیقت سے نگاہیں نہیں پھیر سکتا وہ اپنی شاعری میں ان سب واقعات کو سلیقے کے ساتھ پیش کرتا ہے جو اسے متاثر کرتے ہیں۔ مثلاً آج کے نئے دور میں جو کچھ ہو رہا ہے ایک سچا اور اچھا شاعر اس سے راہِ مفر اختیار نہیں کر سکتا چاہے اس کے بیان کے سلسلے سے اسے کتنا ہی کرب اور تکلیف کا شکار ہونا پڑے۔ شمشاد شاد بھی سماج میں آنکھیں بند کئے نہیں رہتے وہ جو کچھ ظاہری آنکھوں سے دیکھتے ہیں اور باطن میں محسوس کرتے ہیں اس کا بیان کرنے میں دریغ نہیں کرتے۔ مثلاً عصرِ حاضر میں جو بڑے بڑے مسائل ہیں ان میں سیاست کی بدلتی ہوئی تصویر، خیر و شر کا تصادم، محبت کی مٹتی ہوئی ہستی، انسان کا انتہائی مصروف رہنا، غریبوں اور مفلسوں کی بے گھری، فحاشی، حقیقی صحافیوں کا نہ رہنا، ڈاکٹروں اور طبیبوں کی عیاریاں، رشوت کا بول بالا ہونا وغیرہ وغیرہ ہمارے سامنے ہیں۔ موصوف نے اس

کے تحت بہترین اشعار رقم کئے ہیں۔ مثال کے لئے کچھ اشعار دیکھیں:

سیاست میں سبھی چہرے کہاں بے داغ ہوتے ہیں — کچھ ایسے بھی تو ہیں جو نفرتوں کے بیج بوتے ہیں

خیر سے آنکھ چرانے کا نتیجہ ہے کہ آج — ہر طرف سے دلِ انساں کو ہے گھیرا شر نے

جو سچ پوچھو تو کوئی بھی عمل پیرا نہیں اس پر — محبت رہ گئی ہے اب کتابی فلسفہ ہو کر

میسر ہی نہیں آئی کبھی اے شادؔ تنہائی — وگرنہ خود سے جی بھر کے کسی دن گفتگو کرتے

ہم غریبوں کو بھلا اس کے سوا کیا چاہئے — آسماں کی چھت ہے سر پر اور زمیں رہنے کو ہے

خلاؤں میں ہماری بیٹیاں پرواز کرتی ہیں — کہاں روکے ہیں ان کو بندشیں دیوار و در کی اب

صحافتیں ہوئیں جب سے سیاستوں کی غلام — ورق ورق پہ ہے بکھرا حقیقتوں کا لہو

نہاں ہے جس میں بھلائی چھپا کے بیٹھا ہے — طبیبِ وقت دوائی چھپا کے بیٹھا ہے

اگر نہ ہوتا یہاں بول بالا رشوت کا — تو رائیگاں نہیں جاتا لیاقتوں کا لہو

کسی بڑے شاعر کی یہ بھی خصوصیت ہوتی ہے کہ اس کے یہاں عصری مسائل جہاں براہِ راست بیان کئے جاتے ہیں وہیں وہ کچھ ایسی علامتوں کا سہارا بھی لیتا ہے جس کے پسِ پردہ اپنے مافی الضمیر کو بہتر طریقے سے پیش کرتا ہے۔ علامت سے جہاں شعر زمان و مکان کی حدود سے ماورا و مبرّا ہوتا ہے وہیں اس کے وسیلے سے شعر کی تفہیم کے مختلف دھاروں میں غوطہ زن ہونے کا شعور بھی آتا ہے۔ شمشاد شادؔ کے یہاں بہترین علامتوں کا التزام اپنا حق ادا کرتا ہےہکر دار نسورج، دھوپ، سایا، اندھیرا، شب، آئینہ، چاند، برسات، ہوا، سمندر، شجر، واعظ، شراب، رقیب وغیرہ وغیرہ ہیں اس سلسلے سے بھی چند اشعار رقم ہیں:

اے زمیں خود پہ نہ اترا کہ یہ ماہ و انجم — کیا ہے سورج کے نکلنے کا سبب جانتے ہیں

کس بے حسی سے کرتی ہے دنیا پہ وار دھوپ — آئے گی شب تو روئے گی زار و قطار دھوپ

خوف اندھیروں کا نہیں اپنے مقدر میں اگر — ڈھلنا لکھا ہے تو ڈھل جائے گی شب، جانتے ہیں

گر کبھی فرصت ملے تو آئینہ بھی دیکھ لے — کیا رکھا ہے ارفع و اعلیٰ ترے القاب میں

چاند غمگین ہو گیا جب سے — آسماں سے ہے چاندنی غائب

بھیگنے کا بہت ارمان ہے برساتوں میں — اور برسات نہ آئے تو کرے کیا کوئی

رات بھر خود سر ہوانے کی بہت اٹکھیلیاں — خاکساری دیکھئے پھر بھی سمندر چپ رہا

جھکی شاخیں تو فوراً چھانٹ دی جاتی ہیں پیڑوں سے — کفالت کون کرتا ہے کسی بوڑھے شجر کی اب

واعظ شراب پینے سے اب کے نہ روکنا کرنی ہے بے خودی سے مجھے آر پار بس
عیبوں کو میرے مشتہر کر کے کہا رقیب نے عزت اتارنی تھی بس عزت اتار دی گئی

مذکورہ علامتوں سے ان کے مزاج کی نشاندہی ہونے کے ساتھ ساتھ یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ وہ اسلاف سے ملے علمی و ادبی سرمائے اور حقیقی غزل کے طلسم سے خود کو آزاد نہیں کر پاتے۔ان کے یہاں نئی فضا کا احساس تو ہے لیکن اس فضا کا قلب نہایت فراغ ہے وہ اس میں روایتی مضامین کو بھی سمیٹنے میں کوئی مضائقہ نہیں سمجھتے۔اس کا ثبوت ہمیں اس صورت میں بھی ملتا ہے کہ وہ روایتی علائم کے ساتھ ساتھ روایتی تلمیحات کا بھی اپنی شاعری میں قوی اظہار کرتے ہیں۔کمال یہ ہے کہ ہم ان تلمیحات کو علائم کے ضمن میں بھی دیکھ سکتے ہیں۔مثلاً ان کے اشعار میں غارِ حرا کا ذکر، واقعۂ ابابیل، سانحۂ کربلا، موسیٰ و فرعون کا واقعہ وغیرہ وغیرہ نظر آتے ہیں وہ روایتی عناصر کے ساتھ ساتھ جدید دور کے تقاضوں کی بھی مکمل عکاسی کرتے ہیں اور قنوطیت کے بجائے رجائی سرگرمیوں میں مصروف رکھتے ہیں۔کچھ اشعار دیکھیں:

سورۂ اقراء جو دہرایا رسول اللہؐ نے منبعِ انوار پھوٹا تیرگی کے غار سے
کیا ہرائے گا ہوس کا کوئی لشکر اس کو عزم جس شخص کا اے شادؔ ابابیلی ہے
سر پٹکتی ہیں ہوائیں آج بھی بے بسی سے کربلا کی خاک پر
کوئی موسیٰؑ صفت آ کر ڈبوئے ظلم کا لشکر تبھی ہم آج کے فرعون کو غرقاب دیکھیں گے

ان کے یہاں روایت کا ایک اثر یہ بھی نظر آتا ہے کہ وہ اپنی شاعری میں خوبصورت تراکیب اور عمدہ تشبیہات بھی پیش کرتے ہیں۔مثال کے لئے اشعار ملاحظہ کریں:

نازو وہ بھی ایک مٹھی خاک پر اُڑ رہے ہو کاغذی افلاک پر
مکانِ جسم نمی سے نہ منہدم ہو جائے تو اپنی چشمِ تمنا میں جل بھراؤ نہ رکھ

ان اشعار میں 'کاغذی افلاک' 'مکانِ جسم' اور 'چشمِ تمنا' جیسی تراکیب متاثر کئے بغیر نہیں رہتیں۔پہلی ترکیب ہمیں غالبؔ کے یہاں آئی ترکیب 'کاغذی پیرہن' کی یاد دلاتی ہے لیکن کمال یہ ہے کہ یہاں افلاک کو کاغذی بتایا گیا ہے جس سے شاعر کے اختراعی ذہن کا ثبوت ملتا ہے۔'مکانِ جسم' اور 'چشمِ تمنا' عام تراکیب ہیں لیکن شعر میں نہایت پُراثر معلوم ہوتی ہیں۔

ان کی تشبیہات بھی نہایت دلکش ہیں جس میں نئی آواز، نئے ساز، نئی دنیا اور انوکھے پن کا بھرپور احساس ہوتا ہے۔کہتے ہیں:

کھیتوں سے گزرتی ہوئی پگڈنڈی کی صورت ریکھا مری تقدیر کی بل کھائی ہوئی ہے

روایت وجدت سے ملا ان کے یہاں ایک پہلو یہ بھی ہے کہ وہ شعوری طور پر الفاظ کے انتخاب پر نہایت غور وخوض کرتے ہیں وہ کسی بھی لفظ کو معمولی یا گرا پڑا نہیں سمجھتے بلکہ جس لفظ کی جہاں ضرورت ہوتی ہے وہ برجستہ اسے وہاں استعمال کر لیتے ہیں۔اس سلسلے سے ان کے یہاں کئی منزلیں پائی جاتی ہیں،ایک منزل یہ ہے کہ وہ الفاظ کا حسین مرقع سجاتے ہیں اور مختلف الفاظ کے اجتماع سے مصرع یا شعر خلق کرتے ہیں جیسے:

گھٹن،رنج ومحن،آزردگی،تڑپن زیادہ ہے طبیعت میں ہماری ان دنوں الجھن زیادہ ہے

گھٹائیں، پھول،خوشبو،چاندنی راتوں کی بیتابی
تری یادوں کے جانِ جاں یہاں کتنے حوالے ہیں

دوسری منزل اس ضمن میں ان کے یہاں یہ ہے کہ وہ ایسے الفاظ بھی شعر میں پرو دیتے ہیں جو عام بول چال سے متعلق ہوتے ہیں یا شاعری میں ان کا وجود خال خال ہی نظر آتا ہے۔مثلاً:

عیش وعشرت کا ہے سامان میسر لیکن نیند کی دیوی تو السایا بدن مانگے ہے
آسماں تیری شرارت نہیں اس میں کوئی تھوک دراصل یہ میرا ہی گرا ہے مجھ پر
خلاقِ دو جہان کی کریں گے ہم اطاعت دل میں ہے جو ابلیس کے کھنس ہمیں کیا

ان اشعار میں 'السایا' 'تھوک' 'کھنس' جیسے الفاظ کی کیا ادبی حیثیت ووقعت ہے یہ اہلِ زبان بخوبی جانتے ہیں۔لیکن میرا ماننا یہ ہے کہ لفظ کا تاثر بظاہر کچھ نہیں یہ اس وقت کارگر ہوتا جب اس کے استعمال کے طریقے منفرد اور دلچسپ ہونے کے ساتھ ساتھ شاعری کے تقاضوں کو بھی پورا کرتے ہوئے نظر آئیں۔

ایک منزل ان کے یہاں یہ بھی ہے کہ وہ ہندی کے خوبصورت الفاظ بھی اپنے شعر کی زینت بناتے ہیں۔جیسے شیتل،آدھار،جنم،دھن،بکھان،سکھ،چین،سنسار،دھنوان،وغیرہ۔اشعار دیکھیں:

آبِ زم زم یا گنگا جل سب چلتا ہے پیاس لگے تو گرم یا شیتل سب چلتا ہے
تو نے الزام لگا تو دیا غداری کا یہ بتا کیا ترے دعوے کا کچھ آدھار بھی ہے
کس جنم کا جانے مجھ سے لے رہا ہے انتقام کیوں ڈراتا ہے اکیلے میں مرا سایہ مجھے
شفقتوں کا کہاں دنیا میں رہا مول کہ اب باپ سے بیٹا دعائیں نہیں دھن مانگے ہے
خوشی کی چاہ میں غم ہی مجھے ملے ورنہ میں خوب کرتا خوشی کا بکھان کاغذ پر

میں اوروں کے لئے سکھ چین اپنا وار دیتا ہوں مگر بدلے میں مجھ کو درد کا سنسار ملتا ہے
شرارہ بغض ونفرت کا دلوں میں جل رہا ہے خدایا خیر انساں کو ہی انساں چھل رہا ہے
جہاں انصاف دھنوانوں کی داسی بن گیا ہوتو وہاں دل میں رعیت کے تعصب جڑ پکڑتا ہے

ان کا کمال یہ ہے کہ وہ جس صورت سے ہندی کے لفظ کا برجستہ استعمال کرتے ہیں اس سے ان کی مختلف زبانوں کے لئے وسیع القلبی اور وسعتِ نظری کا علم ہوتا ہے۔ساتھ ہی اس صورت میں شاعری کا حسن بھی مجروح نہیں ہوتا۔زبانوں کے سلسلے سے ان کی وسعتِ نظری کا اس بات سے بھی اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ وہ شعر میں انگریزی الفاظ بھی خوبی کے ساتھ برتتے ہوئے نظر آتے ہیں۔مثلاً:

سسٹم کی لاچاری سے تنگ آ کر آخر کار مرے گونگے بہرے ضبط نے دیکھو شور مچایا رقص کیا
بول بالا جھوٹ کا ہے چینل اور اخبار میں دفن ہے سچائی افواہ وخبر کے درمیاں

ان اشعار میں 'سسٹم' اور ''چینل' جیسے الفاظ دلیل پیش کرتے ہیں کہ شمشاد شادؔ کا ہنر یہ ہے کہ وہ الفاظ کے تاثرات سے کھیلتے ہیں ان کو شاعری میں ایسا پیراہن عطا کرتے ہیں جو کسی بھی طرح بے زیب نظر نہیں آتا۔ان کے یہاں الفاظ کے حوالے سے ایک منزل یہ بھی ہے کہ وہ شعر میں بعض مقامات پر نہایت سادگی وسلاست اور سہلِ ممتنع کے پیرائے میں نہایت گہرائی وگیرائی کا مظاہرہ کرتے ہیں۔مثلاً:

عشق کیا ہے تمہیں یہ بتلا دوں روگ یہ لاعلاج ہوتا ہے
اک اشارہ تو ذرا کرتے کبھی جان دے دیتے تمہاری چاہ پر
کچھ نہیں زندگی میں تیرے سوا تو نہیں ہے تو زندگی غائب

اشعار کا تیور بتا رہا ہے کہ کس قدر چابکدستی سے نہایت سادگی کے ساتھ شاعر نے اپنی بات کہی ہے جس کو نثر کی صورت میں بغیر رد و بدل کے پیش کیا جاسکتا ہے اور ساتھ ہی تشریح و مطالب کے متعدد در بھی وا کئے جاسکتے ہیں۔تاریخِ ادب شاہد ہے کہ ہر دور کے شعراء کے یہاں عشق کا جذبہ غالب نظر آتا ہے۔ہر مزاج کے شاعر نے اپنے اپنے تجربات واحساسات کی بنا پر معاملاتِ عشق اپنی شاعری میں سموئے ہیں۔عمومی طور پر روایت کے زیرِ اثر غزل میں محبوب کو بے وفا، ظالم و جابر قرار دیا گیا لیکن نئے دور کا محبوب صرف محبوب ہی نہیں بلکہ وہ محب بھی ہے۔شمشاد شادؔ کا خاصہ یہ ہے کہ وہ جہاں روایتی محبوب کی یاد تازہ کرتے وہیں نئے دور کے نئے

محبوب کا بھی ذکر کرتے ہیں۔مثلاً:

اللہ کرے درد ترا سب پہ عیاں ہو اے دشمنِ جاں تیرے جگر کا بھی زیاں ہو

ظاہر ہے شعر میں روایتی محبوب سانس لیتا ہوا نظر آتا ہے جو محب سے غافل ہے۔اب ایسے میں محب عاجز آ کر دعا دینے سے تو رہا۔اسی لئے وہ چاہتا ہے کہ اس کا محبوب بھی کسی کو دل دے بیٹھے اور رسوائے زمانہ ہو جائے۔لیکن آج کا محبوب روایتی محبوب سے قدرے مختلف ہے۔اس دور کے محبوب سے عشق کر کے عاشق پچھتاتا نہیں بلکہ اس کا التفات حاصل کرتا ہے اور نازاں ہوتا ہے۔شعر ہے:

اپنی قسمت پہ میں نازاں ہوں کہ دلبر میرا خوبصورت ہے، سجیلا ہے، وفادار بھی ہے

پچھلے زمانے کا عاشق محبوب کی تلاش میں صحرا بہ صحرا، دشت در دشت، شہر بہ شہر مارا پھرتا تھا لیکن آج کے دور میں عشق کا رویّہ ہی بدل کر رہ گیا ہے اب کوئی عاشق مجنوں کی صورت اختیار نہیں کرتا۔شعر ہے:

ہوں تیری دید کا طالب مگر تیری خاطر میں شہر شہر پھروں بدحواس، ناممکن

شمشاد شادؔ کی شاعری کے حوالے سے ایک طویل گفتگو کی جاسکتی ہے لیکن مختصر طور پر اتنا کہا جاسکتا ہے کہ ان کی شاعری نئے ادب کے تمام تر تقاضوں پر کھرا اترنے کی بھرپور کوشش کرتی ہے۔ان کی شاعری کے متعدد اسالیب ہیں۔وہ کسی ایک سمت کے مسافر نہیں بلکہ مختلف جہتوں میں بیک وقت پرواز کرنے کا ہنر جانتے ہیں۔وہ کسی ایک کشتی کے سوار نہیں بلکہ کئی کشتیوں میں وہ سفر کرتے ہیں۔کئی سمندر ان کے پیشِ نگاہ ہیں، متعدد منزلیں ان کی فکر کی دست رس میں ہیں۔انھیں کسی مخصوص تحریک سے نہیں جوڑا جاسکتا وہ لاتحریک کی سرحدوں میں اپنے شعری افکار کے کرشمے دکھاتے ہیں۔

☆☆☆

Rubeena Meer ki Shairi mein nisaai hissiyat by Mohd. Shabir

(Research Scholar,deptt.of Urdu MANUU, Hyedrabad)

محمد شبیر (ریسرچ اسکالر، شعبہ اردو، مانو، حیدرآباد)

روبینہ میر کی شاعری میں نسائی حسیت

روبینہ میر عہد حاضر کی ممتاز اور معتبر شاعرہ ہیں۔ روبینہ میر کا تعلق جموں وکشمیر کے خطہ پیر پنجال سے ہے۔ پیشے سے روبینہ میر ایک معلمہ کے طور پر اپنی خدمات دے رہی ہیں۔ شعر وادب میں کافی دلچسپی رکھتی ہیں۔ روبینہ میر عہد حاضر کی ایسی شاعرہ ہیں جو اردو شعر و ادب میں اپنا مقام اور تشخص منوانے میں کامیاب ہو چکی ہیں۔ انھوں نے شعر و شاعری کا آغاز ذرہ تاخیر سے کیا۔ لیکن بہت جلد انہوں نے اپنی شناخت قائم کر لی ہے۔ روبینہ میر خطہ پیر پنجال کے شاعری کے افق پر ایک ابھرتا ہوا ستارہ ہیں۔

انھوں نے اردو شاعری میں غزل اور نظم میں طبع آزمائی کی ہے۔ دونوں صنفوں میں کامیابی حاصل کر چکی ہیں۔ ان کے چار شعری مجموعے تفسیر حیات (۲۰۱۲)، آئینہ خیال (۲۰۱۳)، حرف زار (۲۰۱۷) اور اضطراب (۲۰۲۱) شائع ہو کر داد تحسین حاصل کر چکے ہیں۔ ان کی شاعری کا مطالعہ کرنے سے یہ اندازہ ہوتا ہے وہ جو کچھ معاشرے میں دیکھتی ہیں اور محسوس کرتی ہیں اسے شعری قالب میں ڈھال دیتی ہیں۔ ان کی شاعری کا ارتقائی سفر ابھی جاری ہے۔

روبینہ میر کی شاعری میں موضوعاتی تنوع اور وسعت پایا جاتا ہے۔ انھوں نے اپنی شاعری میں مختلف سماجی، سیاسی اور اقتصادی مسائل کو موضوع سخن بنایا ہے۔ روبینہ میر ایک حساس شاعرہ ہیں۔ انھوں نے اپنی شاعری میں عورت کے جذبات، احساسات، خواہشات، نظریات اور دلی کیفیات کو موضوع سخن بنایا ہے۔ انھوں نے غزلیہ شاعری اور نظمیہ شاعری دونوں میں عورت کے جذبات اور احساسات کی عکاسی کی ہے۔ معاشرے میں عورت کو ثانوی درجے کی سمجھا جاتا ہے۔ بیٹے کی پیدائش پر خوشیاں منائی جاتی ہیں جب کہ بیٹی کی پیدائش کو بوجھ سمجھا جاتا ہے۔ بیٹے کی پرورش اور تعلیم وتربیت پر خاص توجہ دی جاتی ہے جبکہ بیٹے کے مقابلے بیٹی کی تعلیم وتربیت پر اتنی خاص توجہ نہیں دی جاتی ہے۔ تعجب

ہے کہ آج بھی بہت سے خانوادوں میں شوہر اور سسرال والے بہو بیٹیوں کو اس بات پر الزام ٹھہراتے ہیں کہ وہ بیٹیاں پیدا کرتی ہیں۔ روبینہ میر نے ایسی منفی سوچ رکھنے والوں کو بیٹی کی اہمیت اور افادیت کا احساس دلایا ہے۔ اس ضمن میں ان کی ایک مسلسل غزل سے چند اشعار ملاحظہ ہو۔

کیسے بتاؤں تم کو کیا ہوتی ہیں بیٹیاں ہیرے اگر ہیں بیٹے تو موتی ہیں بیٹیاں
ماں، باپ دل شکستہ ہوں تو روتی ہیں بیٹیاں چین و سکون دِل کا یہ کھوتی ہیں بیٹیاں
ماں باپ کو ذرا سی بھی ہو تکلیف اگر ایسے میں رات بھر کہاں سوتی ہیں بیٹیاں
نازک مزاج ہونے کے باوجود بھی یہ دو دو گھروں کا بار ڈھوتی ہیں بیٹیاں

(حرف زار، ص ۴۳)

قبل از اسلام لوگ مختلف قسم کی برائیوں میں مبتلا تھے۔ ظلمت اور جہالت عروج پر تھی۔ انسانی معاشرے میں مختلف قسم کی برائیاں اور رسومات پائی جاتی تھیں۔ ایسی ہی جاہلانہ رسومات میں سے ایک رسم بعض قبیلوں میں بیٹیوں کو زندہ درگور کرنے کی بھی تھی۔ ظہور اسلام سے اس رسم سے لڑکیوں کو ضرور راحت ملی۔ لیکن موجودہ دور میں بھی دختر کشی کا کوئی نہ کوئی معاملہ سامنے آتا رہتا ہے۔ بعض قبیلوں اور خاندانوں میں آج بھی لڑکیوں کو بوجھ سمجھا جاتا ہے۔ قبل از پیدائش مادر رحم میں ٹیکنالوجی کے ذریعے بچے کی تشخیص کی جاتی ہے۔ لڑکی معلوم ہونے پر ٹیکنالوجی اور ادویات کو استعمال میں لاکر مادر رحم میں ہی بچیوں کو قتل کیا جاتا ہے۔ یہ بری رسم اسی زمانہ جاہلیت کی یاد دلاتی ہے۔ جس دور میں لڑکیوں کو زندہ دفنایا جاتا تھا۔ لڑکیوں کی پیدائش کا اوسط دن بدن کم ہوتا جارہا ہے۔ معاشرے میں بعض خاندان چاہے تعلیم یافتہ ہوں یا غیر تعلیم یافتہ لڑکیوں کو بوجھ سمجھ کر مادر رحم میں قتل کر دیتے ہیں۔ دور جہالت کے مقابلے موجودہ دور میں تھوڑی تبدیلی ضرور آئی ہے۔ اُس زمانے میں لڑکیوں کو زندہ دفن کیا جاتا تھا لیکن موجودہ دور میں پیدائش سے قبل ہی قتل کیا جاتا ہے۔ اس ضمن میں روبینہ میر کی نظم ''وطن کی بیٹیوں کے نام'' کا ایک بند دیکھیے۔

اے میرے وطن کی بیٹیو نہ کسی پہ ہرگز یقین کرو
کبھی گاڑ دیتے تھے ریت میں آج مار دیتے ہیں پیٹ میں
کوئی مار کے ڈال دے گیٹ میں کوئی پھینک دے تمہیں کھیت میں

(آئینہ خیال، وطن کی بیٹیوں کے نام، ص ۲۶۸)

عورت سماج، قوم، قبیلہ اور خاندان کا اہم حصہ ہے۔ ملک، قوم، معاشرے اور خانوادے کی ترقی

اور فلاح بہبودی میں عورت برابر کی شریک ہے۔سوائے عورت کے کائنات کی کوئی رونق نہیں ہے۔عورت کے بغیر دنیا نامکمل اور ادھوری ہے۔ایک عورت کے کئی رشتے ہوتے ہیں مثلاً ماں،بہن، بیٹی، بہو، بیوی،ساس وغیرہ۔دختر کشی سے صرف ایک لڑکی کا قتل نہیں ہوتا بلکہ کئی رشتوں کا قتل ہوتا ہے۔اس بات کا احساس روبینہ میر نے اپنی نظم ''حوا کی بیٹی'' میں دلایا ہے ؎

''کیا تم نہیں جانتے؟/کہ میرے بغیر۔۔۔/یہ دنیا نامکمل ہے/میرے بغیر۔۔۔/یہ دنیا بے رنگ ہے/میں صرف لڑکی ہی نہیں ہوں/بلکہ۔۔۔/ماں بھی ہوں۔۔۔/بیوی بھی ہوں۔۔۔/بہن بھی ہوں۔۔۔/ایک لڑکی کو مار کر/تم کتنے رشتے مارو گئے؟'' (آئینہ خیال،حوا کی بیٹی،ص ۳۶۶)

روبینہ میر کی شاعری میں عورت کے جذبات کی شدت ہے۔انھوں نے خلوص اور سچائی کے ساتھ عورت کے جذبات اور احساسات کو اپنے شعری تخیل میں پیوست کیا ہے۔دختر کشی کے مسئلے کی وجہ سے روبینہ میر کافی رنجیدہ اور غمزدہ ہیں ہے۔ایک لڑکی جس نے ابھی آنکھیں کھولی نہیں،دنیا کو دیکھا نہیں اور موت کا سبب بن جاتی ہے ۔بالآخر انسان کیوں بے قصور اور معصوم بچیوں کا قتل کر دیتا ہے۔ان جذبات کا اظہار روبینہ میر نے اپنی نظم ''میرا قصور'' میں کیا ہے ؎

''میں وہ مظلوم ہوں/جو مسلسل چیخے جا رہی ہوں/مگر!/کسی کے کانوں تک میری آواز نہیں پہنچتی/میں وہ کلی ہوں/جسے کھلنے سے پہلے مسل دیا گیا ہے/میں وہ معصوم جان ہوں/جس کے لئے ماں کی کوکھ قتل گاہ ہے/میں وہ بدنصیب ہوں/جسے آنکھ کھولنے سے پہلے ہی کوڑے دان کی نذر کیا جاتا ہے/آخر میری خطا کیا ہے؟/مجھے انصاف دو/میں/ایک لڑکی ہوں۔۔!!/یہی میرا قصور ہے؟''

(آئینہ خیال، میرا قصور،ص ۳۶۹)

روبینہ میر نے عورت کی بے بسی، مجبوری، مظلومیت، مرد اساس معاشرے کی محکومیت اور درد و کرب کی موثر ترجمانی کی ہے۔عورت کے وجود، مقام و مرتبہ کا احساس دلایا ہے۔پدری اساس معاشرے کو للکارتے ہوئے عورت کے وجود، حیثیت، مقام اور مرتبہ سے آشنا کروایا ہے۔اس ضمن میں چند اشعار ملاحظہ فرمائیں ؎

زباں رکھتی ہوں میں بھی منہ میں اپنے اے جہاں والو — مجھے کمزور مت سمجھو کسی صورت جہاں والو
کبھی تُو کر نہیں سکتا مجھے جو کام بخشا ہے — مجھے انسان کی تخلیق کا انعام بخشا ہے
حقیقت ہے مرے ان قدموں کے نیچے ہی جنت ہے — اسی جنت کی گہرائی میں دنیا بھر کی راحت ہے
بطن سے میرے تو پھوٹا ہے خود پر ناز کرتا ہے — میرے ہی سامنے چلاتا ہے آواز کرتا ہے

جہاں والوں نے ہر پل امتحاں میں مجھ کو ڈالا ہے ہزار مشکلیں سہہ کر بھی میں نے تجھ کو پالا ہے
جہاں میں میرے ہی دم سے ترا بول بالا ہے تیری اس بے حسی نے مجھ کو حیرت میں ڈالا ہے

ہمارے سماج میں عورت کو غلام تصور کیا جاتا ہے۔مرد اپنے آپ کو حاکم تصور کرتے ہیں عورت کو محکوم بنایا جاتا ہے۔مرد اپنی مردانگی دکھانے کے لئے عورت پر حکم چلاتا ہے۔عورت کو حکم ماننے پر مجبور کیا جاتا ہے۔مرد جس طرح چاہے اس طرح کا عورت کے ساتھ برتاؤ کرتا ہے۔عورت کو مرد کے ہر حکم کی تعمیل کرنی پڑتی ہے۔جس طرح مرد کہے گا اسی طرح عورت کو ماننا پڑے گا۔بعض مرد عورت کو طلاق کی دھمکیاں دیتے رہتے ہیں۔طلاق کی دھمکی کو ایک ہتھیار کے طور پر استعمال کیا جاتا ہے۔عورت طلاق ہونے کے خوف سے مجبوراً مرد کے ہر حکم کو ماننے پر مجبور ہو جاتی ہے۔عورت کو ہمیشہ یہ ڈر ستاتا رہتا ہے کہ کہیں مجھے طلاق نہ مل جائے۔عورت کے ان جذبات اور احساسات کی عکاسی روبینہ میر کی نظم ''طلاق'' میں ملتی ہے۔

''تمہیں وہی کرنا ہے۔/جو میں کہوں گا۔۔/جو میں چاہوں گا۔۔/چاہے وہ غلط ہی کیوں نہ ہو۔۔۔/ہاں۔۔۔/چاہے وہ غلط ہی کیوں نہ ہو۔۔۔/مگر میں تمہاری بیوی ہوں۔۔۔/بیوی۔۔۔!/کھیل نہیں۔۔۔/تبھی تو کہہ رہا ہوں/''تم میری بیوی ہو''/جو ہتھیار میرے پاس/تمہارے لئے ہے/وہ کسی کھیل کے لئے نہیں/کیونکہ وہ آزاد ہے/اپنی مرضی سے آ جا سکتی ہے/مگر تم۔۔۔/میری مرضی کے بغیر/کچھ نہیں کر سکتی/ورنہ جانتی ہو۔۔۔/میں کیا کر سکتا ہوں۔۔۔؟/مجھے اختیار ہے/کہ جب چاہوں/تمہیں اپنے گھر سے کر سکتا ہوں بے گھر/صرف اتنا کہہ کر/طلاق۔۔۔طلاق۔۔۔طلاق۔۔۔/مگر/یہ بچے/یہ گھر بنانے میں/میں نے جو خون پسینہ ایک کیا/وہ۔۔/سب کس لئے۔۔؟/اگر تم اتنی آسانی سے/لفظ طلاق اپنا سمجھ کر/جب چاہو۔۔۔/کر سکتے ہو استعمال/افسوس۔۔۔!مجھے زندگی بھر/مر مر کر جینا ہے/اس لفظ کے ڈر سے/یہ لفظ ہر روز/مجھے نئی موت مارتا ہے/نہ جانے کب/کہاں۔۔۔؟/تم مجھ سے کہہ دو/طلاق۔۔۔طلاق۔۔۔طلاق۔۔۔''

(حرف زار،طلاق،ص ۱۰۸)

ایک عورت کی جب طلاق ہوتی ہے اس کے دل پر کیا گزرتی ہے یہ وہی طلاق شدہ عورت بہتر جانتی ہے۔روبینہ میر کو طلاق شدہ عورت کے درد و کرب کا احساس ہے۔طلاق شدہ عورت کے جذبات اور احساسات کی بہترین عکاسی روبینہ میر نے اپنی نظم ''کل بھی تھی بے گھر،آج بھی ہے بے گھر'' میں کی ہے ؎

کتنا بے رحمی سے نکال دیا جاتا ہے تجھے یہ کہہ کر طلاق، طلاق، طلاق۔۔۔!
تیرے جسم کے اعضاء یعنی تیرے بچے تجھ سے چھین لیے جاتے ہیں
تیرے ہاتھوں سے بنی کسی چیز پہ تیرا حق نہیں رہتا تجھ سے وہ حق لئے جاتے ہیں
جو مالک بحر و بر نے تجھے عطا کئے ہیں کب تک تو اس ظلم کی شکار رہے گی۔۔۔!
کس سے کرے گی۔۔۔؟ اپنی مظلومیت کی شکایت اس گونگے بہرے۔۔۔سماج میں
کوئی تیری فریاد سننے کو تیار نہیں

(تفسیر حیات، کل بھی تھی بے گھر، آج بھی ہے بے گھر، ص ۲۰۳)

مرد شادی کرنے کے بعد عورت کو اپنی جاگیر سمجھتا ہے۔ اس کے ذہن میں یہ بات نقش ہو جاتی ہے کو عورت جو میرے نکاح میں آئی ہے یہ ہر زاویے سے میری محکوم ہے اور میں اس کا حاکم ہوں۔ وہ جس طرح چاہے عورت کے ساتھ کے سلوک کرتا ہے۔ بعض اوقات مرد عورت کے ساتھ اچھا سلوک نہیں کرتا ہے ؎

عورت کو سمجھو نہ جاگیر اپنی نہ یہ خواب اپنا نہ تعبیر اپنی
کرے دفن خواہش کا اپنے ہی ہاتھوں مسخ کیوں کرے گی تصویر اپنی
اگر یوں ہی چلتا رہا سلسلہ تو یقیناً یہ توڑے گی زنجیر اپنی

(آئینہ خیال، عورت، ص ۲۸۰)

روبینہ میر کی شاعری میں عورت کی زندگی کے کئی مسائل اور رخ موجود ہیں۔ روبینہ میر عورت کی بھر پور نمائندگی اور وکالت کرتی ہیں۔ انھیں عورت کی اہمیت و افادیت، مقام و مرتبہ اور عظمت کا احساس دنیا کے بڑے بڑے بادشاہوں، سیاستدانوں، سائنسدانوں، دانشوروں، محققوں، حکیموں، عالموں، فنکاروں، فلسفیوں اور عظیم ہستیوں کو عورت نے جنم دیا ہے۔ علاوہ ازیں عورت ہی کے بطن سے انبیاء اکرام اور اولیاء اکرام پیدا ہوئے ہیں۔ روبینہ میر نے عورت کے مقام، مرتبہ، حیثیت، عظمت اور اہمیت کا احساس دلایا ہے۔ ؎

ہے وجود زن سے قائم زندگی کا آشیاں اور زندہ اس کلی سے ہے بہار گلستاں
ہیں زمین زن سے پھوٹے خوب رو سرو سمن انبیاء و اولیاء سب اس زمین کے ہیں چمن

روبینہ میر کی شاعری کا مطالعہ کرنے سے یہ واضح ہوتا ہے کہ ان کے پاس ذخیرہ الفاظ وسیع ہے۔ الفاظ کا برمحل اور بموقع استعمال کرنے کا ہنر بھی جانتی ہیں۔ علاوہ ازیں ان کا مطالعہ بھی وسیع

ہے۔ان کی شاعری کا یہ وصف ہے کہ انہوں نے سادہ، سلیس اور عام فہم الفاظ میں بلند تخیل پیش کیا ہے۔پیچیدہ الفاظ اور اصطلاحات سے گریز کیا ہے۔سیاسی، سماجی اور اقتصادی مسائل کے علاوہ خواتین کے مسائل ان کی شاعری کا مرکز اور محور ہے۔انھوں نے اپنی شاعری میں عورت کی بے بسی، مرد غالب معاشرے کا دباؤ، عورت کی محکومیت اور جنسی استحصال جیسے مسائل کو اجاگر کیا ہے۔علاوہ ازیں عورت کی اہمیت وافادیت، مقام ومرتبہ اور قدر ومنزلت سے مرد اساس معاشرے کو روشناس کروایا ہے۔روبینہ میر نے جموں وکشمیر کی خواتین اردو شاعری کے باب میں نسوانی جذبات اور احساسات میں اضافہ کیا ہے۔صنف نازک کا درد ان کے قلب میں رچا بسا ہوا ہے۔

☆☆☆

Hamdi Kashmiri aur unki ghazal goyi by Ubadullah Khanday (M-Phil Scholar, deptt.of Urdu Desh Bhagat University,Fatehgarh,Punjab)
عبداللہ کھانڈے (ایم۔فل اسکالر، شعبہ اردو، دیش بگت یونیورسٹی، فتیح گڑھ، پنجاب)

حامدی کاشمیری اور انکی غزل گوئی

پروفیسر حامدی کاشمیری کا اصل اسم گرامی حبیب اللہ بٹ اور ادبی دنیا میں ان کا تخلص حامدی کاشمیری ہے۔آپ سرینگر کے شمال میں بہوری کدل بازار مسجد کے ایک قدیم علاقے میں ۲۹ جنوری ۱۹۳۲ء کو خواجہ خضر محمد بٹ اور خورشید بیگم کے یہاں پیدا ہوے اور اسی سرزمین پر پرورش اور ابتدائی تعلیم وتربیت حاصل کی۔ چار سال کی عمر میں حامدی کاشمیری کو کلاشپورہ سرینگر کے پیرالاحد شاہ صاحب کی دینی درسگاہ میں داخل کرایا گیا۔ یہاں سے قرآن شریف کا ناظرہ مکمل کرنے کے بعد ان کا داخلہ بہوری کدل کے گورنمنٹ پرائمری اسکول میں درجہ اول میں ہوا۔ یہاں سے پرائمری پاس کرنے کے بعد ۱۹۴۵ء میں ایس۔پی۔ ہائی اسکول باغِ دلاور خاں میں داخلہ لیا اور یہاں سے ۱۹۴۸ء میں میٹرک کا امتحان فرسٹ ڈوژن میں پاس کیا اور اسی سال ایس۔پی۔کالج میں داخلہ لیا۔ ۱۹۵۰ء میں انٹرمیڈیٹ اور ۱۹۵۲ء میں بی۔اے کی ڈگری حاصل کی۔جس میں گولڈ میڈل بھی حاصل کیا۔بی۔اے کی ڈگری کے ساتھ ساتھ انہوں نے فارسی آنرز کی ڈگری بھی حاصل کی اور اول آے۔ ۱۹۵۴ء میں انہوں نے جموں وکشمیر یونیورسٹی سے ایم۔اے اردو کی ڈگری حاصل کی۔ ۱۹۵۹ء میں سینٹرل انسٹیٹیوٹ آف انگلش حیدرآباد سے تدریس کا ایک سالہ کورس بھی مکمل کیا۔ ۱۹۶۶ء میں ''اردو نظم اور یورپی اثرات'' کے موضوع پر کشمیر یونیورسٹی سے پی۔ایچ۔ڈی کی ڈگری حاصل کی۔ ۱۹۵۲ء میں جب حامدی کاشمیری نے انگریزی ادب میں ایم۔اے کی ڈگری حاصل کی تو ایم۔اے کا رزلٹ نکلنے کے تین دن بعد انہیں ایس۔پی۔کالج میں انگریزی لیکچرر کے عہدے پر عارضی طور پر فایز کیا گیا اور ۱۹۵۴ء میں ایس۔پی کالج کے شعبہ انگریزی میں مستقل لیکچرار مقرر ہوے۔

۱۹۵۹ء میں حامدی کاشمیری کلچرل اکاڈمی کے اسسٹنٹ سیکریٹری مقرر ہوے۔ ۱۹۶۱ء

میں شعبہ اردو کشمیر یونیورسٹی سے لیکچرر کی حیثیت سے منسلک ہوئے اور ۱۹۷۶ء میں یہاں ریڈر مقرر ہوئے۔ ۱۹۷۸ء میں پروفیسر کے عہدے پر تعینات ہوئے ۔۱۹۹۱ء میں شعبہ اردو ڈیپارٹمنٹ آف اسپیشل اسسٹنس کے کوآرڈنیٹر مقرر ہوئے، اسی سال ڈین فیکلٹی آف آرٹس کا کام سرانجام دینا شروع کیا۔ اس سے قبل ڈین فیکلٹی آف اورینٹل لینگویجز کی حیثیت سے کام کر چکے تھے۔ اگست ۱۹۹۰ء میں کشمیر یونیورسٹی کے وائس چانسلر کے عہدے پر فائز ہوئے اور دسمبر ۱۹۹۳ء کو اس عہدے سے سبکدوش ہو گئے۔

حامدی کاشمیری کئی رسالوں کے ساتھ منسلک اور مدیر رہے جن میں پرتاپ، بازیافت، تعمیر، شیرازہ اور کشمیر میں اردو ادب شامل ہیں۔ ان کے علاوہ متعدد اداروں کے ممبر بھی رہے جن میں ترقی اردو بورڈ نئی دہلی، اردو مشاورتی کمیٹی، این۔سی۔ای۔آر۔ٹی، ساہتیہ اکاڈمی، سنٹرل کونسل کشمیر یونیورسٹی، مشاورتی بورڈ دوردرشن سرینگر، کشمیری ڈکشنری بورڈ، جنرل کونسل اور سنٹرل بورڈ کلچرل اکاڈمی جموں وکشمیر، اردو مشاورتی کمیٹی اکاڈمی جموں وکشمیر، کشمیری انتخابی بورڈ گیان پیٹھ ایوارڈ اردو نصابی کمیٹی خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔

۱۹۵۷ء میں حامدی کاشمیری نے قیصر قلندر کے ساتھ مل کر ایک ادبی انجمن 'بزمِ اردو' کے نام سے سرینگر میں قائم کی۔ اسکے علاوہ انجمن ترقی اردو کی ریاستی شاخ کے سکریٹری بھی رہے۔ حامدی کاشمیری کی پیدائش سے پہلے ان کی والدہ محترمہ کے دو بیٹے بچپن میں ہی فوت ہو چکے تھے۔ اس لیے وہ عموماً غمزدہ رہا کرتی تھی اور دل شکستہ ہو گئی تھیں۔ تنہائی کے عالم میں اشک بار آنکھوں سے وہ یہاں کے مشہور مقامی شعرا اور صوفی بزرگوں جن میں شیخ العالمؒ، حبہ خاتونؔ، رسول میرؔ، محمود گامیؔ، گلام احمد مہجورؔ وغیرہ کے مقبولِ عام کلام کو زیرِ لب گنگناتی تھی، اس گنگناہٹ نے بچپن سے ہی حامدی کے کانوں میں ادبی رَس گھولا۔

حامدی کاشمیری کو گھر میں ہی ایسا ماحول حاصل ہوا تھا کہ جہاں پہ انھیں اپنے ادبی ذوق کو پروان چڑھانے کے مواقع ملے۔ والدہ محترمہ کا چرغہ کاتتے ہوئے مشہور کشمیری شاعروں کے اشعار گنگنانا اور والد صاحب کا گھر میں شعر وموسیقی کی محفلیں منعقد کروانا ان کے لئے ایک ایسا ماحول سازگار رہا کہ ان کی تخلیق شاعری کی صورت میں اُجاگر ہونے لگیں اور وہ آہستہ آہستہ ایک کامیاب شاعر، افسانہ نگار، ناول نگار اور مشہور نقاد بن کر ادبی دنیا میں آفتاب بن کر جلوہ افروز ہوئے۔ کالج میں زیرِ تعلیم رہنے کے زمانے میں ہی وہ ادبی جلسوں میں شرکت کرتے رہے اور مناظروں میں بھی لیتے

تھے۔ یہاں بزمِ ادب کے رکن بھی رہے اس طرح شعروشاعری اور افسانہ نگاری میں کالج کے دور میں ہی خاصی شہرت حاصل کر چکے تھے۔ حامدی کاشمیری ہمہ جہت شخصیت کے مالک ہیں۔ وہ بیک وقت افسانہ نگار، ناول نگار، شاعر اور تنقید نگار کی حیثیت سے ادبی دنیا میں مشہور ہیں۔ ان کی چند مشہور تصانیف کچھ یوں ہیں:

جدید اردو نظم اور یورپی اثرات (پی۔ایچ۔ڈی مقالہ)، نئی حیت اور عصری اردو شاعری، ہمارا ادب (۱۹۵۹)، اردو نظم کی دریافت، امکانات (تنقید)، متن اور تجزیہ (تنقیدی مقالات)، معاصر تنقید ایک نئی تناظر میں، تفہیم وتنقید، غالب کے تخلیقی سرچشمے، برف میں آگ (منتخب افسانے)، وادی کے پھول (افسانے)، بہاروں میں شعلے (ناول)، پگھلتے خواب (ناول)، اجنبی راستے (ناول) خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔ چونکہ زمانے نے ان کی ناقدانہ حیثیت کو ترجیح دی لہذا بطور نقاد ان کی شہرت بین الاقوامی سطح پر مسلم ہوی اور ہمیشہ رہے گی۔ ان کا شمار گوپی چند نارنگ، آل احمد سرورؔ، کلیم الدین احمد جیسے اہم ناقدین میں ہوتا ہے۔ بلاشبہ حامدی کاشمیری نے ادب کے تقریباً ہر فن پارے میں تبع آزمائی کی ہے لیکن وہ جتنے بڑے ادیب ہیں اتنے ہی بڑے شاعر بھی تھے۔ جب انکی تخلیقی زندگی پر نظر ڈالیں تو یہ حقیقت واضح ہوجاتی ہے کہ شاعری کو انھوں نے اول ترجیح دی ہے اس لیے تنقید کے ساتھ ساتھ اردو شاعری کے دامن کو بھی تھامے رکھا۔ اس میدان میں ابتدای زمانے سے ہی طبع آزمای کرتے رہے اور ایک اعلیٰ درجہ کی شاعری سے اُردو کا دامن وسیع کیا۔ کالج کے ادبی ماحول نے ان کی شعری جیت کو قوت بخشی۔ اُردو کے نامور شعرا و ادباء یعنی غالبؔ، اقبالؔ، فیضؔ، میر تقی میرؔ، احمد ندیم قاسمیؔ، منشی پریم چند، جوشؔ، حالیؔ وغیرہ کی تخلیقات کا مطالہ کرنے کے مواقع فراہم ہوے جس سے ان کے ادبی ذوق میں اضافہ ہوا لہذا کالج میگزین پرتاپ کے اردو سیکشن کے مدیر مقرر ہوے اور یہاں سے ان کے تخلیقی سفر کا آغاز ہوا۔ اس ابتدای تخلیقی سفر میں افسانے، مضامین اور شاعری شامل ہے۔ شاعری میں انہوں نے اردو کے مشہور و معروف شاعر شہزور کاشمیریؔ سے اصلاح لی۔ ان کی پہلی غزل ۱۹۴۹ء ہفتہ روزہ اخبار 'وکیل' سرینگر میں شایع ہوئی یہ غزل ان کے پہلے شاعری مجموعے 'عروسِ تمنا' میں شامل ہے جس کا مطلع ہے ؎

جو رہروآشنائے جزب کامل ہو نہیں سکتے کبھی وہ فائز وامانِ منزل ہو نہیں سکتے

حامدی کاشمیری کو فارسی زبان پر عبور حاصل تھا۔ انکی ابتدائی شاعری میں ہمیں فارسی تراکیب واستعاروں کا ہجوم دیکھنے کو ملتا ہے۔ ان کی شاعری کا پہلا مجموعہ ۱۹۶۱ء میں عروسِ تمنا

تمنتمنا‘‘نایافت(۱۹۷۶)’، لاحرف(۱۹۸۴)،شاخِ زعفران(۱۹۹۱)،وادئِ امکان، نارساتھواس(کشمیری مجموعہ کلام)وغیرہ مجموعہ کلام شامل ہیں۔جن میں انہوں نے اپنے شعری کمالات کو پرُحُسن طریقے سے بیان کیا ہے اور ایسے موضوعات کوقلمبند کرنے کی کوششیں کی ہیں کہ جو ایک کامیاب شاعر کے لئے ہونا لازم وملزوم تصور کی جاتی ہیں۔انہوں نے اپنی شاعری میں نہ صرف نئے موضوعات کوقلم بند کرنے کی جستجوئیں کیں بلکہ ان میں شاعرانہ لوازمات کو بھی پرُحسن اسلوب میں پیش کیا۔خاص طور سے اگر ہم انکی غزل گوئی کی بات کریں تو انہوں نے حُسن وعشقیہ موضوعات کے ساتھ ساتھ نئے موضوعات جن میں عصری آ گاہی شامل ہے اور اپنے وطن سے جڑے سیاسی وسماجی حالات و واقعات کوبھی پیشِ نظر رکھا ہے۔حامدی کاشمیری اپنی غزل گوئی کے سلسلے میں خودرقم طراز ہیں:

’’جہاں تک۔۔۔غزل سے میری وابستگی کاتعلق ہےتواس ضمن میں عرض ہے کہ صنف کو برتنے کے باوجود میں اظہاریت کے فطری اصول کے تحت تجربات کی آزادانہ لسانی تجسیم کاری کو اہمیت دیتا رہاہوں۔۔۔میں شعری کے خالص وجودکوفنی امتیازات سے ماوراسمجھتاہوں،اورصنفی امتیازات کو روا رکھنے کے باوجوداس کے خالص وجود، جواس کا وصف ذاتی ہے،کوہی مقدم گروانتاہوں یہی وجہ ہے کہ میں غزل کے ہرشعرمیں،نظم ہی کی طرح ایک کلی تجربے کی یافت کے لئے ایک منفرد لسانی نظام کی حتی لامکاں پرداخت کی سعی کرتاہوں۔اس تناظر میں دیکھئےتو جدید دور میں بھی غزل کے برتاوکا جواز فراہم ہوتاہے۔(حامدی کاشمیری،لاحرف،ص:۹)

حامدی کاشمیری کے یہاں انسانی زندگی کے مختلف پہلوں کا گہراشعور دیکھنے کوملتا ہے۔اس کے بنیادی معاملات ومسائل پرغوروفکر کرتے ہیں۔انسان کواس کی عظمت سکھاتے ہیں اورنظام کائنات میں اس کو نئے اسمانوں پراڑاتے ہیں۔ان کی شاعری کے انھی عناصر نے ان کوعظمت سے ہمکنار کیاہے۔ان کی شاعری میں ہمیں غم کی ایک ایسی لہر دیکھنے کوملتی ہےجس میں غمِ ذات،غمِ عشق،غمِ وطن اورغمِ دوراں سبھی کچھ شامل ہے ؎

پھر کوئی سانحہ ہوا ہوگا | مہرباں کیوں ہیں غم گُسار بہت
خودہی بےآسرابھی کرتے ہیں | ہاتھ اٹھا کر دعابھی کرتے ہیں

حامدی کاشمیری ظلم و جبر کے خلاف ہمیشہ کمربستہ رہنے اور زمانے سے جُڑے حالات و واقعات پرنظررکھنے کےقائل ہیں اس ضمن میں لکھتے ہیں:

’’میں اس بات کا قائل ہوں کہ شاعر کی عصری آگہی کی پیچیدگی اورتشدید تخلیقی شخصیت کوشعلہ وسیماب

بناتی ہے۔۔۔۔''(حامدی کاشمیری، نایافت،ص:۱۱)

حامدی کاشمیری اپنے وطن کے ان لوگوں کی ترجمانی اپنی شاعری کے ذریعے پیش کرتا ہے، جو مفلسی، افلاس، بے چارگی، مایوسی، غربت اور امیر لوگوں کے استحصال کا نشانہ بنے ہوئے ہیں ؎

دریچے بند، ہوا برف، ہُو کا عالم ہے کہیں پہ ڈوبتے تاروں کا شور ماتم ہے

حامدیؔ پُرعظم رہنے اور اُمید کا دیا ہمیشہ جلائے رکھنے کا درس دیتا ہے ؎

جلائے رکھو لہو کے چراغ پلکوں پر سرکتی دھوپ کا کیا اعتبار ہے لوگو

حامدی کاشمیری نہایت ہی خوش اخلاق انسان ہیں، طبیعت میں سادگی اور ستھراپن ہے اور انسان دوستی اور ہمدردی ان کا خاص وصف ہے۔ اعلیٰ اور ادنیٰ دونوں سے ایک جیسا برتاو کرتا ہے۔ ان کی زبان میں مٹھاس اور اندازِ بیان میں نہایت ہی شائستگی اور نرمی ہے۔ حقیقت میں وہ ایک لائق شفیق اور مخلص انسان ہیں جو کہ کسی سے حسد نہیں رکھتے، صرف حق اور سچائی کا الم ہمیشہ تھامے رہتے ہیں ؎

آتے ہی سر قلم نہیں کرتے پہلے خود آشنا بھی کرتے ہیں

حامدی کاشمیری کی غزل گوئی میں زندگی کی حقیقتوں کا گہرا شعور دیکھنے کو ملتا ہے۔ انہوں نے جو کچھ اپنی زندگی میں دیکھا یا محسوس کیا اسے انہوں نے سحر کاری اندازِ بیان کے ساتھ لفظ و پیکر میں قید کیا۔

لاعلم سب کے سب، ہے خبر آشنا ہوا اب بھی ہے کوہ دشت سفر آشنا ہوا

حامدی کاشمیری کی شاعری میں ایک خصوصیت بہت اہم پائی جاتی ہے اور وہ یہ ہے کہ انہوں نے قدیم روایات کے ساتھ ساتھ جدیدیت کو بھی روا رکھا اور جدیدت ہی کے قائل بھی تھے، لکھتے ہیں:

''میں اپنے قارئین سے مخاطب نہیں ہوں جو میرؔ اور غالبؔ کے ساتھ ساتھ جوشؔ اور فراقؔ کا نام لینے میں کوئی تکلف یا تامل نہیں کرتے۔''(حامدی کاشمیری، لاحرف،ص۔۹)

ہم اس کی کھوج میں نکلے ہوئے ہیں ہمیں اپنا پتہ کوئی نہیں ہے

بنیادی طور پر ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ یہ حامدی کاشمیری کی حب الوطنی کی کشش کا ہی نتیجہ ہے کی جس کی بدولت نہ صرف داخلی سطح پر بلکہ خارجی سطح تک پہنچ کر انہوں نے اپنے مشاہدات کو ادب میں سمیٹنے کی کوشش کی ہے۔ چونکہ کشمیری تہذیب وتمدن اور حُسن و جمال کے ساتھ ساتھ آپ اپنے گردوپیش سے جڑے حالات و واقعات سے بھی بخوبی واقفیت رکھتے تھے اس لئے سیاسی وسماجی حقائق کے اہم مسائل کو بھی انہوں نے اپنے کلام میں پیش کیا۔ یہاں سے انکی شاعری کا ایک نیا موڑ بھی شروع ہوا اور داخلیت پسندی سے نکل کر وہ خارجیتی موضوعات کی طرف مائل ہوئے۔

تشنگی آگ ہے، یہ آگ میں پی لیتا ہوں اب میرے آگے کبھی جام نہ آنے پائے

حامدی کاشمیری اپنے ان سماجی خیالات کی مذید ترجمانی کرتے ہوئے لکھتا ہے:

''۔۔۔۔سیاسی تشدد پرستی، سماجی جبریت اور صنعتی بے چہرگی نے انسان کو ایک نئی ہولناک اور کرب انگیز صورتِ حال سے متضاد مکیا ہے۔'' (حامدی کاشمیری، نایافت۔ص:۱۱)

یہ اور بات گھرے ہیں حِصارِ ظلمت میں ابھی نظر میں طلوع سحر کا عالم ہے

اگر ہم حامدی کاشمیری کی غزل گوئی میں فنی وحسن خیالی کا تجزیہ کریں تو کتابوں کے دفتر جمع ہونگے پھر بھی بات ادھوری ہی رہ جائے گی۔ کیونکہ ان کی شاعری میں نہ صرف تشبیہ، استعارہ اور کنائیہ کا ذخیرہ موجود ہے بلکہ یہاں تہداریت بھی بدرجہ تم پائی جاتی ہے۔تنگ دامنی کی وجہ سے میں نے ان کی غزل گوئی کے موضوعات کو مختصر سمیٹنے کی ایک ادنٰی سی کوشش کی ہے جو حامدی کشمیری کے خیالات سے جُڑے ہیں پھر بھی حق ادا نہیں ہو پایا، اس کے لیے معضرت خواہ ہوں۔

حامدی کاشمیری آخری عمر میں کافی ضعیف ہو گئے تھے۔ کمزوری کی وجہ سے ہاتھوں میں رعشہ، جسم میں نقاہت اور چلنے پھرنے میں دشواریاں پیش آرہی تھیں، جسکی وجہ سے تقریباً کہیں آنا جانا موقوف ہی ہوا تھا۔ اس لیے کسی ادبی سرگرمی میں شراکت نہیں کر پارہے تھے۔لیکن ان کی جو سابقہ کارہائے نمایاں ہیں وہ انہیں ادب کی دنیا میں زندہ جاوید رکھنے میں کافی ہیں۔ ۲۷ دسمبر ۲۰۱۸ء کو آخر وہ دن آہی گیا کہ جب انہوں نے اس دنیائے فانی کو خیر باد کہا اور دائمی زندگی کو لبیک کہہ کر ہم سے رخصت ہوئے۔ اللہ مغفرت فرمائے!

☆☆☆

Urdu Ghazal mein ilm-e-nabatat ki tarjumani karne wala shair Zeenatullah Javed by Mohd. Adil (Research Scholar,deptt.of Urdu &Persian, SupervisorDr. Rehan Hasan,GND university, Amritsar)

محمد عادل (ریسرچ اسکالر، نگراں: ڈاکٹر ریحان حسن، گرونانک دیو یونیورسٹی، امرتسر، پنجاب)

اردو غزل میں علم نباتات کی ترجمانی کرنے والا شاعر: زینت اللہ جاوید

اس میں کوئی شک نہیں کہ پیڑ پودے، اور جنگلات انسان کے پرانے ساتھی رہے ہیں۔ جب انسان نے اس روئے زمین پر قدم رکھا تو اس نے اپنے اطراف میں ہرے بھرے نباتاتی نظام کو پایا۔ اس نظام نے اس کی زندگی کے فروغ اور اس کی بقا کے لئے زمین پر اسباب مہیا کئے اور اسے ترقی کی راہ سے روشناس کرایا۔ پیڑ پودوں اور جنگلات کے سبب نہ صرف انسانی زندگی بلکہ دیگر مخلوقات چرند اور پرند کے لئے بھی نظامِ حیات قائم ہوا۔ اس ہرے بھرے ماحول نے زمین کو حسن اور جاذبیت عطا کی۔ اس کی گرد و غبار میں اٹی ہوئی سطحوں پر منفرد رنگ کے پھول اور بیل بوٹے لگائے، تصور کیجئے اگر یہاں سبزے کی ہریالی، گلہائے رنگ رنگ کی کونپلیں، پھول اور ان پر گردش کرتی ہوئی تتلیاں، بھنورے، پتنگے اور درختوں کے اوپر خوبصورت پرندوں کے بسیرے اور ان کی دلکش اور پیاری پیاری آوازیں نہ ہوتیں تو یہ دنیا کتنی ویران اور خوف ناک معلوم ہوتی۔ یہ ہرے بھرے لہلہاتے ہوئے پیڑ پودے، ان لگے ہوئے رنگ برنگے پھول اور پھل ان سے نکلنے والی طرح طرح کی خوشبوئیں انسان کو قدرتی ماحول کے سحر میں قید کر لیتی ہیں۔ کیوں کہ یہ نظام ہماری حیات کا اہم جز ہے اور اس کے بغیر زندگی کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا۔ اس لئے شعوری اور لاشعوری طور پر یہ دنیا کے ہر زبان و ادب کا اہم حصہ رہا ہے۔ ہر دور اور ہر خطے کے ادبی فن پاروں میں اس نباتاتی نظام کی منفرد ترجمانی دیکھنے کو ملتی ہے۔

اگر اردو ادب کی بات کریں تو اردو کی نثری اصناف ہو یا شعری اصناف دونوں میں اس کا تذکرہ دیکھنے کو ملتا ہے۔ ہمارے ادباء و شعراء نے علامتوں اور استعاروں کا سہارے لے کر منفرد مفاہیم کے پیرائے میں ہرے بھرے قدرتی نباتاتی نظام کی عکاسی کی ہے۔ لیکن حیرت کا مقام یہ ہے کہ اگر عصر

حاضر میں ان علامتوں اور استعاروں کا مطالعہ سائنسی نقطۂ نظر اور علم نباتات کی رو سے کیا جائے تو یہ عہد حاضر کے سائنسی موضوعات اور علم نباتات کی بہت سے حقائق کے ترجمان نظر آتے ہیں۔

سائنسی علوم کی وہ شاخ جس میں پیڑ پودوں اور اس کی مختلف اقسام کے بارے میں مطالعہ کیا جاتا ہے۔اس کو علم نباتات (Botany) کہا جاتا ہے۔اس مضمون میں ان کی فیجیولوجی، ساخت، جینیاتی، ماحولیاتی، تقسیم، درجہ بندی، اور اقتصادی اہمیت کا مطالعہ کیا جاتا ہے۔اور ساتھ میں کسی مخصوص علاقے، رہائش یا جغرافیائی دور کی نباتاتی زندگی کا جائیزہ لینا بھی اسی میں شامل ہے۔اس میں پودوں کی حیاتیات، پودوں سے متعلق سائنس، عضویت کی خصوصیات، نسلی نباتیات اور پودوں کی نئی پرجاتیوں کی تلاش بھی شامل ہے۔بوٹنی کے اندر پھولوں کی کاشتکاری (Floriculture) اور انتھولوجی (Anthology) کے موضوعات بھی شامل ہیں۔انتھولوجی ایک یونانی(Greek) لفظ ہے جو دو یونانی لفظوں انتھوس(Anthos) یعنی پھول اور لیجین (Legein) یعنی انتخاب کرنا سے مل کر بنا ہے۔اس میں پھولوں اور اس کے پودوں کا مطالعہ کیا جاتا ہے۔

اگر غور کریں تو ہر زبان وادب کے شاعروں اور ادیبوں کے کلام میں مختلف پھولوں کا ذکر دیکھنے کو ملتا ہے۔اردو ادب کے شعراء اور ادباء نے بھی پھول کے حسن، اس کی دلکشی اور بھینی بھینی خوشبو سے متاثر ہو کر اس کو بطور علامت اور استعارے کی صورت میں اپنے ادبی فن پاروں میں ڈھال کر پیش کیا ہے۔لیکن دلچسپ بات یہ ہے کہ اگر ان ادبی فن پاروں کو عصر حاضر کی جدید سائنسی دریافتوں اور انکشافات کی روشنی میں رکھ کر ان کے معنی ومطالب اخذ کئے جائیں تو ان میں علم نباتات اور اس سے متعلق بہت سے موضوعات مثلاً فلوریکلچر، اور انتھولوجی کی ترجمانی دیکھنے کو ملتی ہے۔مثال کے طور پر غالبؔ کے ایک شعر پر غور کریں:

سبزہ وگل کہاں سے آئے ہیں ابر کیا چیز ہے ہوا کیا ہے

دراصل غالبؔ کا یہ شعر علم نباتات کی ترجمانی میں پیش کیا جاسکتا ہے۔کیوں کہ غالبؔ اس شعر کے توسط سے سبزہ وگل کی ساخت اور ماہیت کو سمجھنے کے بارے میں تدبر کرنے کے لئے آمادہ کر رہے ہیں۔ساتھ ہی اس بات پر بھی تحقیق کرنا چاہتے ہیں کہ ابر اور ہوا کا کسی گل کو کھلانے میں کیا رول ہے۔بالفاظ دیگر غالبؔ ایک ماہر علم نباتات کی طرح ردعمل کرتے ہوئے معلوم دیتے ہیں۔جس طرح ایک باٹنی کے میدان سے وابستہ ریسرچر کسی مخصوص خاندان کے پودے اور اسکے پھل، پھول، پتیوں اور دیگر حصوں کا مشاہدہ کر کے اس کے اوپر تحقیق کرتا ہے اور اس سے متعلق حیرت انگیز انکشافات کرتا

ہے کہ کس درجۂ حرارت اور آب و ہوا میں پودہ پروان چڑھے گا، نشوونما پائے گا۔ ٹھیک اسی طرح غالبؔ کے ذہن میں یہ سوالات گردش کرتے ہوئے معلوم دیتے ہیں۔

غالبؔ کے یہاں سے ہی نہیں بلکہ اردو شاعری کے مختلف ادوار سے متعدد شعراء کے کلام سے ایسے اشعار پیش کئے جاسکتے ہیں جو سبزہ وگل کی بہت سی خصوصیات اور فوائد کے ترجمان ہیں اور ان پر تحقیق کرنے کے لئے آمادہ کرتے ہے۔ غالبؔ سے پہلے میر تقی میرؔ بھی علم نباتات سے متعلق موضوعات کی ترجمانی اپنے کلام کے ذریعے کر چکے ہیں۔ ان کا شہرۂ آفاق شعر جس میں وہ محبوب کے لب کو پھول کی پنکھڑی سے تشبیہ دیتے ہوئے کہتے ہیں:

نازکی اس کے لب کی کیا کہیئے　　پنکھڑی اک گلاب کی سی ہے

میرؔ کا یہ شعر بھی پھول کی ساخت اور اس کی پنکھڑی کی نازکی پر تحقیق کرنے اور غور وفکر کرنے کی دعوت دیتا ہوا معلوم دیتا ہے۔ اسی طرح کلاسیکی شاعری سے لے کر عصر حاضر تک کے کلام میں کہیں نہ کہیں ہمیں علم نباتات سے متعلق موضوعات کی عکاسی دیکھنے کو ملتی ہے۔ اور اگر یہ کہیں کہ عصر حاضر میں زینت اللہ جاوید ایک ایسے منفرد لب و لہجے کے شاعر ہیں جنھوں نے علم نباتات سے متعلق بہت سے موضوعات کو اپنی شاعری میں پیش کر کے اردو شاعری کو نئے سائنسی رنگ وآہنگ سے آشنا کرایا ہے تو کسی طرح غلط نہ ہوگا۔ ان کے شعری مجموعے ''آئینے کا گھر، رنگ خوشبو روشنی، لاحاصل، خط کشیدہ'' میں جگہ جگہ علم نباتات کے مختلف موضوعات پر صادق آنے والے اشعار دیکھنے کو ملتے ہیں۔ اور ان کے اشعار صف قرطاس پر اس طرح مہکنے لگتے ہیں جس طرح پھول گلستاں میں مہکتے ہیں۔ ان کا کلام پڑھنے کے بعد قاری نہ صرف قدرت کے حسین حسن سے آشنا ہوتا ہے بلکہ غور وفکر کے سمندر میں بھی غوطہ زن ہوجاتا ہے۔ یہ زینت اللہ جاوید کے عمیق مطالعہ اور وسیع والنظری کا کمال ہے کہ ان کے کلام میں کائنات کے مختلف موضوعات سمٹ کر آگئے ہیں۔ اور خاص طور سے علم نباتات کے موضوعات کو موصوف نے جس چابکدستی اور ہنرمندی سی پیش کیا ہے اس کی مثال کہیں اور دیکھنے کو نہیں ملتی ہے۔ ان کے یہاں رنگ، خوشبو، روشنی کلیدی الفاظ کی حیثیت رکھتے ہیں اس لئے انہوں نے اپنے ایک مجموعے کلام کا نام ''رنگ خوشبو روشنی'' رکھا ہے۔ غور کیا جائے تو یہ لفظیات ہمارے نباتاتی نظام سے بھی ہم آہنگ ہیں۔ اس لئے ان کے کلام میں شعوری اور لاشعوری طور پر علم نباتات سے متعلق مختلف موضوعات کا ملنا یقینی ہوجاتا ہے۔ مثال کے طور پر ان کی غزل کا ایک شعر دیکھیں:

نازکی تو اس کے لب پہ ختم ہے　　برگ گل میں نازکی جیسا ہے کیا

جاویدؔ صاحب اپنے اس شعر میں میرؔ کی طرح برگ گل سے محبوب کے لب کا موازنہ کر رہے ہیں۔ بظاہر تو موصوف اپنے اس شعر میں پھولوں کی پنکھڑی پر محبوب کے لب کی نازکی کو فوقیت دیتے ہیں۔لیکن ان کے استفہامیہ لہجہ نے اس شعر میں ذو معنیت پیدا کر دی ہے۔مصرع ''برگ گل میں نازکی جیسا ہے کیا'' ہمیں برگِ گلاب کی نازکی پر تحقیق اور غور وفکر کرنے کی دعوت دیتا ہوا معلوم ہوتا ہے۔ماہرین علم نباتات کے مطابق پھول پودوں کا اہم حصہ ہے۔اس کے ذریعے پودے کی افزائش نسل کا کام بھی عمل میں آتا ہے۔اس کے نر اور مادہ حصے کے ملنے سے نئے بیج بنتے ہیں۔

اس عمل کو زیرگی کہا جاتا ہے۔زیرگی (Pollination) زردانے پھولکے نر تولیدی اعضاء اسٹیمن (Stamen) کے ایک حصے اینتھر (Anther) سے مادہ کے تولیدی اعضاء کارپل (Carpel) کے ایک حصے اسٹگما (Stigma) تک منتقل ہونا زیرگی کہلاتا ہے۔پھولوں میں پولینیشن کے دو طریقوں یعنی بائیوٹک پولینیشن (Biotic Pollination) جس میں جاندار عوامل کیڑے،مکوڑوں اور پرندوں وغیرہ شامل ہوتے ہیں۔ اور ابیوٹک پولینیشن (Abiotic Pollination) جس میں غیر جاندار عوامل مثلا ہوا، پانی، بارش کے ذریعے زردانے ایک حصے سے دوسرے حصے تک منتقل ہوتے ہیں۔اس طرح نئے بیج بنتے ہیں اور نئے پودے وجود میں آتے ہیں اور ان پر پھول لگتے ہیں۔اور یہ نظام اسی طرح قائم رہتا ہے۔زینت اللہ جاوید کا ایک شعر ملاحظہ کریں جس میں وہ ہواؤں کے ذریعے گل کھلانے کی بات کر رہے ہیں۔گویا ابیوٹک پولینیشن کی ترجمانی کر رہے ہیں:

یہ ہوائیں بھی گل کھلاتی ہیں ان زمینوں کو کون سمجھائے

غور کریں تو جاویدؔ صاحب نے اپنے اس شعر میں ایک عام محاورہ ''گل کھلانے'' کا استعمال کیا ہے۔جس کا مطلب ہے کوئی عجیب یا انوکھا کام ہونا۔لیکن ان کے اس محاورے نے علم نباتات سے متعلق ایک دلچسپ موضوع کی بھی عکاسی کر دی ہے کہ کیسے ہوائیں گلوں کی افزائشِ نسل اور نئے بیج بننے میں مدد کرتی ہیں۔شعر کے دوسرے مصرعے میں موصوف زمینوں کو سمجھانے کی بات کر رہے ہیں۔یعنی عام سطحی علم رکھنے والوں کو علم نباتات کے رازوں سے آشنا ہونے کے لئے آمادہ کر رہے ہیں۔اس میں کوئی شک نہیں کہ ہرے بھرے اور لہلہاتے ہوئے پودے ان پر لگے ہوئے نازک اور رنگ برنگے مہکتے ہوئے پھول انسانی دل و دماغ کو سکون اور آنکھوں کو ٹھنڈک عطا کرتے ہیں۔اگر ہم اپنے گھروں میں پھولوں کو لگاتے ہیں تو اس سے گھر کے حسن میں اضافہ ہوتا ہے۔اور گرمیوں کے

موسم میں یہ درجۂ حرارت کو کم کرنے میں بھی مددگار ثابت ہوتے ہیں۔لیکن کچھ پھول ایسے بھی ہوتے ہیں جو زیادہ گرمی برداشت نہیں کر سکتے اور دھوپ کی طپش میں مرجھا جاتے ہیں۔ایسے میں ہم اپنے گھروں میں ایسے پھولوں کو لگا سکتے ہیں جو سورج کی طپش اس کی گرمی کو برداشت کر سکیں اور کھلتے،مہکتے رہیں۔ایسے پھولوں کو گل دوپہری انگریزی میں پورٹولاکا(Portulaca) کہتے ہیں۔اس پودے کی خاصیت یہ ہے کہ یہ انتہا سے زیادہ گرمی میں بھی افزائش پاجاتے ہیں۔گل دوپہری کو دوپہری اس لئے بھی کہا گیا ہے کہ اس کے پھول دوپہر میں کھلتے ہیں جب کہ شام میں بند ہو کر مرجھا جاتے ہیں۔جاوید صاحب نے اپنے اس شعر میں دل کو گل سے تشبیہ دے کر شام میں اس کے افسردہ ہونے یعنی مرجھا جانے کی بات کر کے گل دوپہری کی اس خاصیت کی طرف ذہن کو مرکوز کیا ہے کہ کس طرح شام ہونے پر پھول مرجھا جاتا ہے۔یعنی وہ گل دوپہری کے کھلنے اور مرجھانے کے سبب پر غور وفکر کی دعوت دے رہے ہیں:

مثلِ گل جاوید دل تھا تازہ تر شام ہوتے ہوتے افسردہ ہوا

پھولوں میں ایک پھول ایسا بھی ہے جو پتھروں کے درمیان کھلتا ہے۔جسے سیاہ پتھر کا پھول (Black Stone Flower) یا پرموٹریما پرلیٹم (Parmotrema Perlatum) کہتے ہیں۔یہ ایک قسم کا فنگس یا کائی ہے۔جو نمناک مقامات پر پتھروں میں پیدا ہوتی ہے۔اس کا استعمال گرم مصالحوں کے ساتھ کھانے میں خوشبو اور ذائقے کے لئے ہوتا ہے۔اور جڑی بوٹی کے طور پر بھی بہت سی ادویات بنانے میں بھی اس کا اہم کردار ہے۔مختلف زبانوں میں اس کے مختلف نام ہیں جیسے سنسکرتمیں شیلیام تمل میں کلپاسی پنجابی میں ڈگردا پھول مراٹھی میں ڈگڈ پھول تیلگو میں راٹھی پوتھا ، کنڑ میں کللو ہووا ور ہندی میں پتھر کے پھول یہ پھول،چین، جاپان، جرمنی، کینیڈا وغیرہ میں بھی پایا جاتا ہے اور اپنی غذائیت اور ادویاتی خصوصیت کی وجہ سے جانا پہچانا جاتا ہے۔زینت اللہ جاویدا پنے ایک شعر کے اندر پتھروں میں پھول کی انگڑائی لینے کا ذکر کرتے ہیں تو ذہن پتھر کے پھول کی طرف مائل ہوتا ہے:

وہ پھول لینے لگا پتھروں میں انگڑائی کسی کے دست ہنر سے یہ کھل رہا ہے کیا

جاوید صاحب کا یہ شعر غور کریں تو پتھر میں پھپھوند کی صورت اگنے والی کائی یعنی پتھر کے پھول کے کھلنے کا ترجمان نظر آتا ہے۔اس کے ساتھ ہی موصوف نے دوسرے مصرع میں استفہامیہ لہجہ اختیار کر کے ان عوامل پر تحقیق کرنے کی طرف ذہن کو مرکوز کیا ہے جس کے سبب پتھر میں اس پھول نے

انگڑائی لی ہے۔

فوٹو سنتھیسس (Photosynthesis) ایک ایسا عمل ہے جس کے ذریعے سبز پودے ماحول سے کاربن ڈائی آکسائیڈ اور مٹی سے پانی لے کر سورج کی روشنی اور کلوروفیل کی موجودگی میں اپنی خوراک کی ترکیب کرنے کے قابل ہوتے ہیں۔ کھانا سادہ کاربوہائیڈریٹ جیسے چینی کی شکل میں ترکیب کیا جاتا ہے۔

فوٹو سنتھیسس سبز پودوں کی سب سے اہم حیاتیاتی کیمیائی سرگرمیوں میں سے ایک ہے۔ اس عمل میں، شمسی توانائی کو توانائی کی قابل استعمال شکلوں میں تبدیل کیا جاتا ہے۔ نامیاتی مالیکیولز میں پائی جانے والی تقریباً تمام توانائی فوٹو سنتھیس کا نتیجہ ہے۔ ہماری زندگی کی تمام بنیادی ضروریات مثلاً خوراک، ایندھن (لکڑی، کوئلہ، پیٹرولیم)، کپڑے اور آکسیجن براہ راست یا بالواسطہ فوٹو سنتھیسس کا نتیجہ ہیں۔ اور فوٹو سنتھیسس کا عمل سورج کی روشنی یعنی دھوپ کی موجودگی میں ہی عمل میں آتا ہے۔ دھوپ میں رہ کر ہی ہرے پودے پروان چڑھ کر تناور درخت بنتے ہیں۔ اس فکر کی ترجمانی میں جاوید صاحب کا ایک شعر ملاحظہ کریں جس میں وہ سورج کے سایہ دار ہونے اور دھوپ میں رہ کر کامیاب ہونے یعنی فوٹو سنتھیسس کے عمل کی طرف اشارہ کرتے ہوئے معلوم دیتے ہیں:

میں سایہ دار ہوں سورج کی مہربانی سے　　درخت دھوپ میں رہ کر ہی کامیاب ہوا

زمین میں بوئے گئے بیج سے درخت بننے تک کا سفر بڑا ہی دلچسپ اور حیرت انگیز ہے۔ ماہرین علم نباتات نے اس پر تحقیق کرنے کے بعد بہت سے حیرت انگیز انکشافات کئے ہیں کہ کس طرح ایک چھوٹا سا بیج جب اس کو مٹی میں بویا جاتا ہے تو وہ اپنے قدرتی ماحول میں پرورش پا کر مختلف مراحل سے گزرتا ہے۔ اس سے کونپل نکلتی ہے، پودا نکلتا ہے، پتیاں، پھول پھل لگتے ہیں۔ پتیاں سورج کی روشنی، مٹی سے معدنیات اور پانی لے کر پودے کے لئے غذا تیار کرتی ہیں۔ اس طرح یہ بیج ایک تناور شجر میں تبدیل ہو جاتا ہے۔ جس کو پروان چڑھانے میں قدرتی ماحول اور عناصر اہم رول ادا کرتے ہیں۔ زینت اللہ جاوید اپنی غزل کے ایک شعر میں بیج کے خول سے شجر بنے تک کے سفر اور اس کو پروان چڑھانے والے عناصر کے بارے میں غور و فکر کی دعوت دیتے ہوئے نظر آتے ہیں:

ہے ابھی اپنے خول میں جاوید　　تو اگر چاہے تو شجر کر دے

اس شعر کو پڑھنے کے بعد ہر وہ قاری جس کو علم نباتات میں ذرا بھی دلچسپی ہے۔ لطف اندوز ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا۔ کیوں کہ جاوید صاحب نے بڑے ہی منفرد انداز میں قاری کے ذہن کو بیج کے خول

سے باہر نکلنے سے لیکر اس کے تناور شجر بنے کے عمل پر تحقیق کرنے کی طرف ذہن کو مرکوز کیا ہے۔اسی موضوع پر ایک اور شعر دیکھیں:

یقین ہے وہی کونپل درخت بھی ہوگی جو اپنے خول سے باہر نکل کے آئی ہے

ماہرین کے مطابق جس طرح بدلتے ہوئے موسم کے اثرات انسانات اور حیوانات پر پڑتے ہیں اسی طرح نباتات پر بھی اس کے اثرات دیکھنے کو ملتے ہیں۔جاڑا، گرمی، برسات، خزاں اور بہار کے موسم میں پیڑ پودوں کے اندر بہت سی تبدیلیاں دیکھنے کو ملتی ہیں۔خزاں اور بہار دو ایسے موسم ہیں جن کا ذکر شعراء کے کلام میں بھی جگہ جگہ دیکھنے کو ملتا ہے۔بہار کے موسم کو شعراء نے جہاں خوشی اور امید کی علامت بنا کر پیش کیا ہے وہیں خزاں یعنی پت جھڑ کا موسم اداسی، مایوسی اور بچھڑنے کے کرب سے متعلق موضوعات کی علامت اور استعارہ بن جاتا ہے۔فرانس کے مشہور و معروف ادیب اور فلاسفر البرٹ کیمو کے نزدیک خزاں بہار کا دوسرا روپ ہے۔وہ کہتا ہے ''بہار میں تو پھول کھلتے ہیں جب کہ خزاں میں ہر پتا خود پھول بن جاتا ہے''۔سرخ، ہرے، زرد پھول اور پتے سنہری اور پھر سرمئی رنگ کے خشک ہو کر نیچے گر جاتے ہیں اور شاہراہوں، پگڈنڈیوں اور راستوں کو بھر دیتے ہیں جو ایک سحر انگیز سا منظر تخلیق کرتے ہیں۔خزاں کے موسم میں پھول اور پتوں کا رنگ بدل کر گر جانے کے پیچھے کیا وجوہات ہیں اس پر ماہرین علم نباتات نے تحقیق کر کے بہت سے رازوں سے پردہ اٹھایا ہے۔ماہرین کے مطابق پتوں میں کلوروفل نامی ایک مادہ ہوتا ہے جو اُن پتوں کو سبز رنگ فراہم کرتا ہے۔ان کے علاوہ پودوں میں ایک اور کیمیائی عنصر کیروٹینائڈز بھی پایا جاتا ہے۔پودوں میں یہ مادہ کلوروفل کے نیچے موجود ہوتا ہے اور ایک عرصے تک اپنی موجودگی ظاہر نہیں کرتا۔سردیوں میں جب کلوروفل ختم ہونے لگتا ہے اس وقت یہ مادہ ابھر کر آتا ہے اور پتوں کو سنہرا، پیلا یا سرمئی رنگ کا کر دیتا ہے۔کلوروفل دھوپ یا سورج کی روشنی سے اپنی توانائی پاتا ہے۔جتنا زیادہ سورج روشن ہوگا کلوروفل بھی اتنا ہی بھرپور، اور پتہ اتنا ہی سبز ہوگا۔موسم خزاں یا سرما میں سورج چونکہ کم نکلتا ہے جس کے باعث پتوں میں کلوروفل بننے کا عمل کم ہوتا جاتا ہے۔سردیوں میں چونکہ سورج جلدی ڈھل جاتا ہے لہٰذا کلوروفل کو موقع نہیں مل پاتا کہ وہ سورج سے توانائی حاصل کر کے پتے کو رنگ فراہم کرے لہٰذا وہ آہستہ آہستہ ختم ہونے لگتا ہے۔یہ عمل راتوں میں اور بھی تیزی سے ہوتا ہے کیونکہ سردیوں کی راتیں لمبی ہوتی ہیں۔مختصر دنوں اور لمبی راتوں کے باعث پتوں میں موجود سبز رنگ آہستہ آہستہ ختم ہونے لگتا ہے اور پتے نارنجی، سرمئی، یا سنہری ہو کر خشک ہو جاتے ہیں اور بالآخر گر جاتے ہیں۔موسم خزاں سے

متعلق موصوف کا ایک شعر ملاحظہ کریں:

میں زرد ہو کے چھڑنے لگا ہوں کیوں جاوید یہ بات میری مرے سبز خاندان سے پوچھ

موصوف کا یہ شعر خزاں میں پتوں کے زرد ہونے پر تحقیق کرنے کے لئے ذہن کو متوجہ کر رہا ہے۔ شعر میں جاوید صاحب ''سبز خاندان سے پوچھ'' کہہ کر قاری کو غور وفکر اور تحقیق کی دعوت دے رہے ہیں۔ وہ قاری کے ذہن کی رسائی اس فکر تک کرانا چاہتے ہیں کہ وہ اس بات کا سبب تلاش کرے کہ کس طرح ایک ہرا بھرا سایہ دار درخت اور اس کے پتّے زرد ہو کر سوکھ رہے ہیں۔ یہاں یہ شعر اس بات کی بھی دعوت دے رہا ہے کہ ہم سبز خاندان یعنی نباتات سے تعلق رکھنے والی ان تمام پیڑ پودوں اور جڑی بوٹیوں کی نسلوں اور پرجاتیوں پر تحقیق کریں جو پہلے ماضی میں اپنا وجود رکھتی تھیں اور عصر حاضر میں ختم ہو چکی ہیں یا مستقبل میں ہم سے بچھڑنے والی ہیں۔

پیڑ پودے صرف موسم خزاں میں ہی نہیں سوکھتے بلکہ ان کے اندر لگنے والی بیماریاں بھی ان کے مرجھانے اور سوکھنے کا سبب بنتی ہیں۔ ایسے پیڑ جو کسی بیماری کے سبب سوکھ کر مرجھا جاتے ہیں ان پر بدلتے ہوئے موسم اور اس کے تیور کا کوئی اثر دیکھنے کو نہیں ملتا ہے۔ اپنے ایک شعر میں جاوید صاحب اس حقیقت سے پردا اٹھاتے ہوئے کہتے ہیں:

سوکھا ہوا اک پیڑ ہوں کیا مجھ پہ اثر ہو موسم کے بدلتے ہوئے تیور سے الگ ہوں

دراصل ماہرینِ علم نباتات کے مطابق جب کوئی پودا یا درخت کسی بیماری کے لگنے یا دیگر اسباب کے سبب اپنا سبز رنگ کھونے کے بعد پیلا پڑ کر مرجھا جاتا ہے تو وہ مردہ ہونے لگتا ہے۔ کیوں کہ سبز پیڑ پودوں میں فوٹو سنتھیسس کا عمل رک جاتا ہے۔ اس کی وجہ سے پودے کے دیگر حصوں تک غذائی عناصر نہیں پہنچ پاتے۔ اسطرح دھیرے دھیرے پیڑ پودوں کی جڑیں اور اس کا تنا، شاخیں، پتے، پھول پیلے اور زرد رنگ کے ہونے لگتے ہیں کیوں کہ ان کو ہرا رنگ عطا کرنے والا کلوروفل ضائع ہو جاتا ہے۔ اس لئے جب پیڑ بیماری لگنے کے بعد مکمل طور پر سوکھ جاتا ہے تو اس پر کسی بھی موسم کا کوئی اثر نہیں پڑتا۔ اس سائنسی حقیقت کو زینت اللہ جاوید اپنے اس شعر میں بڑے منفرد انداز میں پیش کر دیتے ہیں۔ اسی موضوع پر دیگر اشعار ملاحظہ کریں جس میں وہ پیڑ کے سوکھنے کے بعد اس کے گرنے اور شاخوں سے پرندوں کے چلے جانے سے گھر کے آنگن کے ویران ہونے کا ذکر کر رہے ہیں:

موسم بھی جسم و جان کو کب تک ہرا کرے بوسیدہ پیڑ گرنے لگا ہے تو کیا کرے

ویران سے آنگن میں شجر سوکھ رہا ہے شاخوں پہ پرندوں کی تلاوت بھی نہیں ہے

بلاشبہ جاویدؔ صاحب نے نہ صرف نباتاتی نظام کو سمجھنے کے لئے ذہن سازی کی ہے بلکہ وہ ان موضوعات کے ذریعے انسانی زندگی کے بہت سے پہلوؤں کو از سر نو تلاش کرنے کی بھی سعی کر رہے ہیں۔ایک شعر دیکھیں جس میں وہ اس بات کی طرف اشارہ کتے ہیں کہ روئے زمین پر انسانی وجود کی بقا کے سلسلے میں پیڑ پودوں کی کیا اہمیت ہے جن کے سبب زمین پر ایک منظم حیاتیاتی اور ماحولیاتی نظام قائم ہوا:

یہ بھی خود کی تلاش ہے جاویدؔ زرد شاخِ شجر اٹھاتا ہوں

یہاں یہ شعر نہ صرف خود کے وجود کی تلاش کے مفاہیم کا ترجمان ہے بلکہ اس شعر کے پیرائے میں موصوف نے ''زرد شاخ شجر اٹھانے'' کا ذکر کے شجر اور اس کی شاخ کی ان خصوصیات پر بھی تحقیق کرنے کے لئے متوجہ کیا ہے جو انسانی وجود کی بقا یعنی اس کو مختلف بیماریوں سے نجات دلانے میں کارآمد ہیں۔ایسے بہت سے اشجار ہیں جن کی شاخوں اور پتوں سے ادویات تیار کی جاتی ہیں اور جن کے ذریعے انسان خود کا علاج کرتا ہے۔بارش کا نظام قدرت کی طرف سے ہمیں عطا کیا گیا ایک تحفہ ہے جس کے ذریعے زمین پر نظام حیات چلتا ہے۔ماحول میں نمی برقرار رہتی ہے۔اور درجۂ حرارت میں کمی آتی ہے۔زمینیں سرسبز شاداب ہوتی ہیں۔

کھیت،کھلیان، باغات میں فصلیں اور پیڑ پودے، پھل، پھول اُگتے ہیں۔موسم معتدل ہوتا ہے۔تصور کریں اگر بارش بالکل نہ ہوتو ہمارا حیاتیاتی نظام درہم برہم ہوکر رہ ہوجائے گا۔زیر زمین موجود پانی کی تہہ نیچے چلی جائے گی۔فصلیں برباد ہوجائیں گی۔نہر،ندی، نالے،تالاب سوکھ جائیں گے۔قحط سالی اور گلوبل وارمنگ کے مسائل میں اضافہ ہوگا۔اس کے برعکس اگر کثرت سے بے موسم مسلسل بارش اور ژالہ ہونے لگےتو اس کے نتائج بھی بڑے خطرناک ثابت ہوں گے۔اس کے سبب طوفان اور سیلاب کا خطرہ لاحق ہوگا۔اور زیادہ پانی کے سبب فصلیں برباد ہو جائیں گی۔ہندوستانی زراعت ریسرچ انسٹی ٹیوٹ کے زرعی ٹیکنالوجی تجزیاتی مرکز فصلوں کو بربادی سے بچانے اور ان کے تحفظ کے لئے سرگرم عمل ہے۔ماہرین نے گزشتہ سالوں میں بے موسم بارش اور ژالہ سے متعلق ریسرچ کر کے اس بات کی وضاحت کی ہے کہ بے موسم اور ایک مناسب مقدار سے زیادہ ہونے والی موسلا دھار بارش، ژالہ باری اور تیز ہواؤں سے کھیتوں میں فصلوں کو نقصان ہوا ہے، باغات میں آم کا بور بھی اور اس میں بیماری بڑھنے کے خطرات بڑھے ہیں۔ساتھ ہی پودوں میں پولینیشن کا مسئلہ پیدا ہورہا ہے۔اس لئے نباتاتی نظام کے تحفظ کے لئے اس سے متعلق تمام مسائل کا

حل تلاش کرنا ہوگا اور اس پر تحقیق کرنی ہوگی تا کہ ہماری فصلیں ہر موسم میں محفوظ رہ سکیں۔ زینت اللہ جاوید اپنے ایک شعر میں زیادہ بارش کے سبب فصلوں اور زمینوں کے برباد ہونے کے مسائل پر روشنی ڈالتے ہوئے کہتے ہیں:

پکی فصلوں کو بارش کھا نہ جائے زمینوں کو ہوس دلدل نہ کر دے

زینت اللہ جاوید اس بات سے بخوبی آشنا ہیں کہ عصر حاضر میں کس طرح انسان سائنس اور ٹیکنالوجی کی ترقی کے نام پر اپنے قدرتی ماحول کے ساتھ کھلواڑ کر رہا ہے۔ جس کے سبب موسموں کے نظام میں بھی تبدیلی دیکھنے کو ملی ہے۔ اور اس کے مضر اثرات ہماری فصلوں پر پڑے ہیں۔ تیار اور پکی ہوئی فصلیں بے وقت بھاری بارش کے سبب برباد ہو جاتی ہیں۔ تیز بارش اور ژالہ باری کے سبب فصلیں زمین پر بچھ جاتی ہیں۔ اسی طرح ضرورت سے زیادہ بارش اور پانی پڑنے سے بھی کھیت کی مٹی کا کٹاؤ ہوتا ہے۔ کھیت کی زرخیز مٹی بھی بہہ جاتی ہے اور بعض اوقات مٹی دلدلی صورت اختیار کر لیتی ہے۔

فصلوں کو اگانے کے لئے طرح طرح کے کیمیکل کا استعمال کیا جاتا ہے۔ جس سے پیداوار تو بڑھ جاتی ہے لیکن زمیں کی زرخیزی ختم ہو جاتی ہے۔ اور ایک وقت ایسا آتا ہے جب زمین مکمل طور پر بنجر ہو کر بے جان ہو جاتی ہے۔ اس سلسلے سے جاوید صاحب کہتے ہیں:

جاوید آرزو اب اگتی نہیں ہے کوئی شاید ہماری مٹی بے جان ہو گئی ہے

اسی فکر کی ترجمانی میں ایک اور شعر ملاحظہ کریں جس میں جاوید صاحب زمین کی زرخیزی ختم ہونے کے بعد اگنے والی نباتات کی خاصیت کے کھو جانے پر افسوس کرتے ہوئے کہتے ہیں:

اب زمیں کی کوکھ میں پہلی سی وہ ممتا کہاں پھول تو کھلتے ہیں لیکن رنگ و بو کچھ بھی نہیں

الغرض زینت اللہ جاوید کے کلام کا مطالعہ کرنے کے بعد علمِ نباتات کے مختلف موضوعات اور اس سے متعلق متعدد مسائل کے بارے میں پتا چلتا ہے۔ جس پر عصر حاضر کے ماہرین علم نباتات تحقیق کر رہے ہیں۔ ظاہر ہے کے زینت اللہ جاوید کی شعری کائنات کا دائرہ بہت وسیع ہے۔ اس میں کوئی مبالغہ نہ ہوگا اگر یہ کہا جائے کہ زینت اللہ جاوید پہلے ایسے شاعر ہیں جنہوں نے علم النباتات کی اتنی واضح ترجمانی کی ہے کہ شاعری کا حسن بھی برقرار رہتا ہے۔ اور اس کے معنی و مفاہیم سائنسی حقائق کے بھی ترجمان ہو جاتے ہیں۔

کتابیات:

(1)۔ شعری مجموعہ ''آئینے کا گھر'' زینت اللہ جاویدؔ، ناشر: کارواں مالیر کوٹلہ (پنجاب) سال

اشاعت: دسمبر 2007ء

(2) ۔شعری مجموعہ ''رنگ خوشبو روشنی'' زینت اللہ جاویدؔ ،ادارۂ ادبیاتِ برار گلستاں کالونی،جعفرنگر، ناگپور،سال اشاعت:2021ء

(3)۔شعری مجموعہ''لاحاصل'' زینت اللہ جاویدؔ ،،ادارۂ ادبیاتِ برار گلستاں کالونی،جعفرنگر، ناگپور،سن اشاعت:2022ء

(4)۔شعری مجموعہ''خط کشیدہ'' زینت اللہ جاویدؔ ،،ادارۂ ادبیاتِ برار گلستاں کالونی،جعفرنگر، ناگپور،سن اشاعت:2023ء

(5)۔''حیاتیات'' گیارھویں جماعت کی درسی کتاب،نیشنل کونسل آف ایجوکیشنل ریسرچ اینڈ ٹریننگ،نئی دہلی سن اشاعت:2006ء

(6)۔''نباتات''بی۔ایس۔سی،سال اول مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی حیدرآباد

☆☆☆

Tasawwuf aur Urdu Shairi by Farzana Ansari (Research Scholar, deptt.of Urdu, Barkatullah University, Bhopal)

فرزانہ انصاری (ریسرچ اسکالر برکت اللہ یونیورسٹی، بھوپال)

تصوف اور اردو شاعری

تصوف کسی فرقہ، مذہب، مسلک یا انتساب کا نام نہیں بلکہ تصوف ایک فکر ہے، ایک ریاضت ہے اور مجاہدہ ہے جو قلب و نظر پر پڑے ہوئے پردوں کو ہٹا دیتا ہے اور حقائق کا انکشاف کرتا ہے یعنی تصوف وہ علم ہے جو حق تعالی کو سمجھنے میں مدد کرتا ہے۔ خالق و مخلوق دونوں سے محبت، تزکیہء نفس، طہارت قلب کا طریقہ سکھاتا ہے۔ صبر و قناعت، توکل، فقر و مسکینی، سنجیدگی، خاموشی، ذکر و فکر، عبادت و ریاضت نیکی اور اخلاق کا درس دیتا ہے۔ تصوف کے لغوی معنی پشمینہ پوشی یا خواہشات نفس سے پاک ہونا ہے۔ بعض علماء کا خیال ہے کہ یہ لفظ صوف سے مشتق ہے جس کے معنی پشم یا اون ہے اور جو صوف کا لباس پہنتے تھے وہ لوگ صوفی کہلائے۔ وہ فقیر منش ہوا کرتے تھے، سادہ لباس پہنتے تھے۔ بعض لوگوں کی نظر میں صوفی صفا سے مشتق ہے کیونکہ صوفیا نفس کی صفائی کیا کرتے۔ ایک خیال یہ بھی ہے کہ صوفی صفہ سے مشتق ہے جو مسجد نبوی سے ملحق چبوترے کا نام تھا۔ اس پر اہل صفہ یعنی تقریباً ۴۰۰ اصحاب رسول ﷺ عبادت و ریاضت میں مشغول رہا کرتے تھے۔ انہوں نے اپنے آپ کو بارگاہ رسالت کے لیے وقف کر دیا تھا۔ سادہ لباس پہنتے اور سادہ غذا استعمال کرتے تھے۔ چونکہ صوفیا کرام کی زندگی میں اصحاب صفہ کی زندگی کی جھلک نظر آتی ہے اس لیے ان کو صوفی کہا جاتا ہے۔ یعنی صوفی وہ ہے جو راہ تصوف کو اختیار کرے

ہر چیز سے زیادہ اللہ کی رضا کو ترجیح دے۔ تصوف تمام انسانی لذتوں کو ترک کر کے نفس کو کنٹرول کرنے کا نام ہے۔ خواہش نفسانی سے نجات حاصل کر کے حق کی تلاش و جستجو کا نام ہے اور جب کوئی شخص راہ تصوف کو اختیار کرتا ہے، بصیرت سے کام لے کر حق کی طرف رجوع ہوتا ہے رجوع الا اللہ ہوتا ہے تو ذوالنون مصری فرماتے ہیں کہ ''جس وقت وہ بولتا ہے اس کی گویائی حقیقتوں سے پردے اٹھا دیتی ہے۔''

مسائل تصوف: تصوف میں جن مسائل پر بحث کی جاتی ہے وہ وحدت الوجود، وحدت الشہود، غیریت یا دوئی، فلسفہ حسن و عشق، عشق حقیقی و مجازی، عقل و عشق، فنا و بقا، صوفیانہ اخلاق، نفس، انسانی خواہشات، فقر و غنا، انسانی اعمال، مسائل خیر و شر، تقدیر و تدبیر، دنیاوی زندگی اور اس کی ناپائیداری، بے ثباتی، وغیرہ ہیں۔ اردو شاعری میں تصوف کی روایت: اردو شاعری کی رویت بہت قدیم ہے اس کی جڑیں بہت گہری ہیں۔ صوفیانہ شاعری نے اصطلاحات اور رمز و ایما کے پردے میں انسان دوستی، رواداری، خدمت خلق، وسیع النظری، قلبی طہارت اور بلند اخلاقی کا درس دیا ہے۔ تصوف کی اس روایت پر نظر ڈالیں تو شعراء کرام کی ایک حسین کہکشاں نظر آتی ہے جنہوں نے اپنی شاعری کو پیغام رسانی اور قلبی واردات کے اظہار کا ذریعہ بنایا۔ ان شعراء میں خواجہ بندہ نواز گیسو درازؒ، بابا فرید گنج شکرؒ، امیر خسرو، میراں جی شمس العشاق، برہان الدین جانم، شیخ سعدی دکنیؒ، شیخ شرف الدین یحیی منیری، بوعلی قلندر پانی پتی، خواجہ میر درد وغیرہ کے نام نمایاں ہیں۔

فلسفہ وحدت الوجود: وحدت خق تعالی کی صفت ہے اور کثرت کائنات کی صفت ہے۔ وحدت نے اپنے آپ کو کثرت میں ظاہر کیا ہے لیکن وحدت ہی کثرت کی شیرازہ بند ہے یعنی عالم کثرت کی حقیقت وحدت اور وحدت کا ظاہری روپ کثرت ہے۔ حق تعالی ہر شے کی اصل، ہر شے پہ محیط ہے۔ وہی تمام کائنات کے اندر اور اس کے باہر موجود ہے۔ تمام مظاہر میں اس کا ظہور ہے وہ رنگ و نور کی تمام اشکال میں جلوہ گر ہے۔ تصوف کے اس مضمون کو شعراء نے اپنے اپنے اسلوب میں بیان کیا ہے۔ اردو شاعری کے بابا آدم ولی دکنی کہتے ہیں:

ہر ذرہ عالم میں ہے خورشید حقیقی یوں بوجھ کہ بلبل ہوں ہر اک غنچہ وہاں کا ولی

خدائے سخن میر تقی میر کے کلام میں بہ کثرت متصوفانہ خیالات پائے جاتے ہیں۔ فلسفہ وحدت الوجود کو میر نے کچھ اس طرح بیان کیا ہے:

گرچہ تو ہی ہے سب جگہ ہے موجود ہم کو تیری نہیں ہے جا معلوم میر

تھا مستعار حسن سے اس کے جو نور تھا خورشید میں بھی اس ہی کا ذرہ ظہور تھا میر

خواجہ میر درد صوفیانہ شاعری کے امام کہلاتے ہیں۔ درد صوفیانہ شاعری کی اس روایت کے امین ہیں جو فارسی شعراء رومی، جامی اور عطار سے ہوتی ہوئی اردو میں منتقل ہوئی۔ شاعری درد کا ذریعہ معاش نہ تھی اور نہ شہرت کا سبب بلکہ دلی جذبات کا اظہار شاعری کا سبب بنا۔ درد نے جس طرح مضامین معرفت، سلوک و تصوف کو شاعری میں سمویا ہے وہ بے مثال ہے۔ آسان زبان اور سادہ لفظوں میں

انہوں نے بڑی بات کہی ہے۔ لکھتے ہیں:

جگ میں آ کر ادھر ادھر دیکھا تو ہی آیا جدھر دیکھا دردؔ

ارض وسماں کہاں تری وسعت کو پا سکے میرا ہی دل ہے وہ جہاں تو سما سکے دردؔ

مرزا اسد اللہ خاں غالبؔ کا فلسفیانہ کلام بڑی گہرائی و گیرائی کا حامل ہے۔ فلسفہ وحدت الوجود ان کے یہاں کارفرما نظر آتا ہے، غالباً یہ ان کا پسندیدہ فلسفہ تھا، اس ایک رنگ کے مضمون کو انہوں نے سو ڈھنگ سے باندھا ہے۔ فرماتے ہیں:

نہ تھا کچھ تو خدا تھا، کچھ نہ ہوتا تو خدا ہوتا ڈبویا مجھ کو ہونے نے نہ ہوتا میں تو کیا ہوتا غالبؔ

اسے کون دیکھ سکتا کہ یگانہ ہے وہ یکتا جو دوئی کی بو بھی ہوتی تو کہیں دو چار ہوتا غالبؔ

خواجہ حیدر علی آتشؔ کہتے ہیں کہ جلوہ حق ہر جہت میں نمایاں ہے لیکن اس کے مشاہدے کے لیے تصفیہ قلب اور بصیرت شرط ہے:

چاروں طرف سے صورت جاناں ہو جلوہ گر دل صاف ہو ترا، تو ہے آئینہ خانہ کیا آتشؔ

حیدر آباد دکن کے صاحب فکر شاعر سید جلال الدین توفیقؔ کے کلام میں تصوف کا رنگ غالب ہے وہ نور بہ معنی وجود لیتے ہیں۔ کہتے ہیں:

وحدت میں نور تیرا کثرت میں نور تیرا واں بھی ظہور تیرا یاں بھی ظہور تیرا توفیقؔ

مرزا محمد رفیع سوداؔ کہتے ہیں :

ہر اک شے میں سمجھ تو ظہور کس کا ہے شرر میں روشنی، شعلے میں نور کس کا ہے؟ سوداؔ

کائنات کی ہر شے اک انفرادی شان رکھتی ہے اور ہر شے کی یہ انفرادیت خدا کی وحدانیت کی عکاسی کر رہی ہے۔ رئیس المتغزلین جگرؔ مرادآبادی فرماتے ہیں:

ہر اک مکاں میں کوئی اس طرح مکیں ہے پوچھو تو کہیں بھی نہیں، دیکھو تو یہیں ہے

وہی گل ہے، وہی بلبل، پروانہ ہے شان ہے ایک مگر رنگ جداگانہ ہے جگرؔ

انسان کی نظر ظاہر بیں ہے وہ کسی بھی شے کی ظاہری شکل وصورت پر یقین کر لیتا ہے اس کی حقیقت تک نہیں پہنچتا۔ فانیؔ بدایونی کہتے ہیں کہ کسی شے کی تہہ میں جا کر دیکھو تمہیں جلوہ حق نظر آئے گا:

تہہ میں جا سطح سے تو قطع نظر کر کے دیکھ قطرے قطرے میں سمندر ہے نظر پیدا کر فانیؔ

فلسفہ حسن وعشق : حسن وعشق کا موضوع ہر کس وناکس کی توجہ کا مرکز رہا ہے۔ قدیم یونانی مفکرین سے لے کر جدید مغربی حکماء، اسلامی مفکرین، صوفیا نیز شعرائے اردو وفارسی کا یہ خاص موضوع سخن رہا ہے

اور غزل کے قالب میں تو اس کی حیثیت روح کی سی ہے۔ حسن حقیقی کائنات کی ہر شے میں جلوہ گر ہے جسے دیکھنے کے لیے بصیرت شرط ہے یہ حسن عشق کی تخلیق کرتا ہے اور عشق اپنی انتہائی منزلوں پہ پہنچ کر خود حسین ہو جاتا ہے، دونوں لازم وملزوم ہو جاتے ہیں۔ دراصل عشق ایک حسی کیفیت یا جذبے کا نام ہے جو دل میں سرور اور عقیدت پیدا کرتا ہے، دل و دماغ کو بیدار کرتا اور روح کو جلا دے کر اس میں سوز و گداز بھر دیتا ہے۔ اسے سراپا خیر کہا جا سکتا ہے۔ ولی کہتے ہیں:

شغل بہتر ہے عشق بازی کا کیا حقیقی و کیا مجازی کا ولی

شیخ برہان الدین جانم خدا کو عشق اور عشق کو رب کہتے ہیں اور کائنات کو تابع عشق قرار دیتے ہیں:

ایسا عشق وہ آپیں رب اس عشق رب کا عالم سب جانم

حسن ہر طرف چھایا ہوا ہے لیکن حجاب میں ہے۔ اصغر گونڈوی کہتے ہیں:

اس جلوہ گاہ حسن میں چھایا ہے ہر طرف ایسا حجاب چشم تماشہ کہیں جسے اصغر

کائنات کے حسن میں حسن ازلی نظر آتا ہے۔ مرزا مظہر جان جاناں کہتے ہیں:

سحر اس حسن کے خورشید کو جا کر جگا دیکھا ظہور حق کوں دیکھا، خوب دیکھا، باضیا دیکھا

مظہر جان جاناں

اکبر حسین اکبر الہ آبادی کو حسن حقیقی کی جلوہ نمائی ہر جگہ نظر آتی ہے۔ ہمہ اوست کا تصور انہیں بھی دلنشین معلوم ہوتا ہے۔ وہ کہتے ہیں:

سچ ہے کسی کی شان یہ اے نازنیں نہیں تو ہر جگہ ہے جلوہ گر اور پھر کہیں نہیں اکبر

فنا و بقا: صوفیا کے نزدیک فنا سے مراد یہ ہے کہ انسان عشق حقیقی میں اپنی بشری صفات کا خاتمہ کر دے (جیسے لالچ حرص، دنیاوی محبت، مال و منال سے محبت) اور بقا یہ ہے کہ اپنے اندر خدائی صفات یعنی صفات الٰہیہ پیدا کرے۔ ایسا کرنے سے اس کی بشری حدود ٹوٹ کر لامحدودیت کے سمندر میں غوطہ زن ہو جاتی ہے اور بقائے دوام حاصل ہوتی ہے۔ سراج اورنگ آبادی اس فلسفے کو یوں بیان کرتے ہیں:

تو فنا ہو اگر بقا چاہے نیستی میں تو دیکھ ہستی ہے سراج

عشرت قطرہ ہے دریا میں فنا ہو جانا درد کا حد سے گزرنا ہے دوا ہو جانا غالب

صوفیا کے نزدیک فنا کا دوسرا مفہوم عشق میں خدا کو اپنے اندر اس طرح دیکھنا کہ خود اپنا وجود باقی نہ رہے:

من تو شدم تو من شدی　　من تن شدم تو جاں شدی
تا کس نہ گوید بعد ازیں　　من دیگرم تو دیگری

عقل و عشق: صوفیا کرام نے عشق کو اصل ایمان اور جان مذہب قرار دیا ہے۔ عشق کے بغیر ایمان بے روح اور بے جان ہے۔ عقلی دلائل کے ذریعہ ذات باری اور عشق حقیقی کو نہیں سمجھا جا سکتا۔ اس کے لیے علم باطنی، وجدان و ایقان کی ضرورت ہوتی ہے اور یہ چیزیں بھی خدا کے عشق و معرفت سے حاصل ہوتی ہیں۔ عشق حقیقی کے اسرار و رموز علم و عقل کے دام سے آزاد ہیں۔ علوم ظاہری اور عقل انسانی زمان و مکان میں محدود ہیں اور حقیقی علم یعنی علم روحانی زمان و مکان سے ماورا ہیں، انہیں سمجھنے کے لیے علم تدریسی نہیں بلکہ علم ادریسی کی ضرورت ہوتی ہے۔ عقل و عشق کی حقیقت اور ان دونوں کا موازنہ شعراء اردو نے بڑی خوش اسلوبی سے کیا ہے۔ عشق کے مقابلے عقل کی کم مائیگی کو غواصیؔ نے نہایت اور سیدھے سادے الفاظ میں بیان کیا ہے۔ فرماتے ہیں:

جا ہی نہیں عقل کو دم مارنے یہاں　　جاں عشق واں ہے گنگ زباں قیل و قال سے　　غواصیؔ

سراجؔ اورنگ آبادی نے عشق و سرمستی کے جو راگ چھیڑے ہیں وہ نغمہ سرمدی بن گئے۔ ان کے کلام میں عقل و عشق کا موازنہ اس طرح نظر آتا ہے:

خبر تحیر عشق سن، نہ جنوں رہا نہ پری رہی　　نہ تو تو رہا، نہ تو میں رہا، جو رہی سو بے خبری رہی
کبھی سمت غیب سیں کیا ہوا، کہ چمن ظہور کا جل گیا　　مگر اک شاخ نہال غم جسے دل کہیں وہ ہری رہی

وہ عجب گھڑی تھی میں جس گھڑی لیا درس نسخہ عشق کا
کہ کتاب عقل کی طاق میں جوں دھری تھی تیوں ہی دھری رہی　　سراجؔ

ڈاکٹر علامہ اقبالؔ کو فلسفہ و تصوف کے مطالعہ نے ایک خاص نقطہ نظر عطا کیا انہوں نے نظم و نثر دونوں کے ذریعہ اپنا نقطہ نظر واضح کیا ہے عقل و عشق کے اس فلسفے کی اس گتھی کو سلجھاتے ہوئے وہ کہتے ہیں کہ عقل کی قوت کائنات کی تسخیر میں معاون ہوتی ہے لیکن اس کی تگ و دو صرف کائنات مادی تک محدود ہے زبان و مکان سے ماورا حقائق تک اس کی پہنچ نہیں اگر چہ انسان عقل کے ذریعہ اپنی منزل تک پہنچنے کی کوشش کرتا ہے لیکن یہ راہ پر پیچ اور گمراہ کن ہے۔ اس کے مقابلے عشق حقیقی کی طاقت انسان کو تیز رفتاری کے ساتھ منزل مقصود پر پہنچا دیتی ہے۔ عشق عقل کی رہبری کر سکتا ہے لیکن عقل عشق کی رہبری نہیں کر سکتی۔ عقل حیلے بہانے تلاش کرتی ہے، نفع نقصان کی فکر میں رہتی ہے، جب کہ عشق حقیقی سچا، بے غرض اور بے لوث ہوتا ہے۔ اقبالؔ فرماتے ہیں:

عقل کو تنقید سے فرصت نہیں عشق پر اعمال کی بنیاد رکھ

بے خطر کود پڑا آتش نمرود میں عشق عقل ہے محو تماشائے لب بام ابھی

عشق کی اک جست نے کر دیا قصہ تمام اس زمین و آسماں کو بے کراں سمجھا تھا میں اقبالؔ

عشق حقیقی انسان کو عرش کی بلندی تک پہنچا دیتا ہے۔ فانی کو لافانی بنا دیتا ہے، خاکی کو نوری کر دیتا ہے، یہاں تک کہ عاشق حقیقی کو محترم و معظم بنا دیتا ہے۔ جگرؔ کہتے ہیں:

ترے عشق کی کرامت یہ نہیں تو اور کیا ہے کبھی بے ادب نہ گزرا مرے پاس سے زمانہ

بے کسان رہ الفت کو سمجھتے کیا ہو عرش ہل جائے اگر دل سے یہ فریاد کریں جگرؔ

تزکیہ نفس: صوفیا نے ہمیشہ تزکیہ نفس کی تلقین کی ہے۔ کیونکہ نفس ایک ایسی شے ہے جس کی تسکین باطل سے ہوتی ہے اور وہ کبھی راہ حق طے کرنے نہیں دیتا۔ نفس انسان کو عیش و عشرت کی طرف لے جاتا ہے دنیاوی محبت پر مجبور کرتا ہے، گمراہ کرتا ہے لیکن نفس پر قابو کر کے اوصاف زمیمہ کو اوصاف حمیدہ میں تبدیل کیا جا سکتا ہے اور نفس پر قابو پانا مجاہدہ کرنا کہلاتا ہے جسے جہاد پر فضیلت ہے۔ نفس کی موافقت بندے کی ہلاکت کا سبب ہے اور اس کی مخالفت نجات کا باعث ہے۔ شعرائے اردو نے تزکیہ نفس کا مضمون بڑے سلیقے سے رقم کیا ہے۔ خاقانی ہند استاد ابراہیم ذوقؔ لکھتے ہیں:

نہنگ و اژدہا و شیر نر مارا تو کیا مارا بڑے موذی کو مارا نفس امارہ کو گر مارا ذوقؔ

حرص و ہوس: صوفی اور وہ لوگ ہیں جو حرص و ہوا سے لالچ و طمع سے پاک ہوا کرتے ہیں کیوں کہ انسان کو حرص و لالچ گمراہ کر دیتا ہے یہ فتنہ و فساد کا سبب ہے۔ نظیر اکبر آبادی حرص و ہوا سے بچنے کی تلقین اس طرح کرتے ہیں:

ٹک حرص و ہوس کو چھوڑ میاں مت دیس بدیس پھرے مارا قزاق اجل کا لوٹے ہے دن رات بجا کر نقارا

کیا بدھیا، بھینسا، بیل، شتر کیا گوئیں پلا سر بھارا کیا گیہوں، چاول، موٹھ، مٹر کیا آگ دھواں اور انگارا

سب ٹھاٹھ پڑا رہ جائے گا جب لاد چلے گا بنجارہ

صبر و قناعت: اگر انسان صبر و قناعت اختیار کرے تو وہ اپنے لیے ہی نہیں دوسروں کے لیے بھی باعث سکون بن جاتا ہے۔ صبر و قناعت سے انسان کو بے فکری، سکون اور اطمینان کی دولت نصیب ہوتی ہے۔ آتشؔ کہتے ہیں:

شگفتہ رہتی ہے خاطر ہمیشہ قناعت بھی بہار جاوداں ہے آتشؔ

دنیا کی بے ثباتی: یہ دنیا فانی ہے اور اس کی بے ثباتی کا نقشہ شعرائے اردو نے بڑے موثر انداز

میں پیش کیا ہے:

کیا بھروسہ ہے زندگانی کا آدمی بلبلہ ہے پانی کا
جس سر کو غرور آج ہے یاں تاج وری کا کل اس پہ یہیں شور ہے نوحہ گری کا میرؔ

ہم نے اردو شاعری میں تصوف کا رنگ شعراء قدیم اور شعراء متوسط کے یہاں دیکھا لیکن تصوف کی یہ جھلک جدید شعراء کے کلام میں بھی نظر آتی ہے۔ جاویدؔ انصاری برہان پوری نے فلسفہ عشق کو اپنے کلام میں اس طرح پیش کیا ہے:

عشق متاع لازوال، عشق حیات جاوداں حسن کا اعتبار کیا یہ ابھی ہے ابھی نہیں جاویدؔ انصاری

راحت اندوری، مشہور و معروف شاعر جن کا گزشتہ سال انتقال ہوا، نے محبت اور سیاست پر تو خوب شاعری کی ان کے کلام میں بھی تصوف کی جھلک نظر آتی ہے۔ کہتے ہیں:

اک نہ اک روز کہیں ڈھونڈ ہی لوں گا تجھ کو ٹھوکریں زہر نہیں ہیں کہ کھا بھی نہ سکوں

راحت اندوری

برہان پور کے نوجوان شاعر ڈاکٹر عارف انصاری درس و تدریس کے پیشے سے منسلک ہیں، شعر و ادب کی خدمت کو اپنا مشغلہ بنا رکھا ہے، تصوف کی رویت کو کچھ اس طرح آگے بڑھاتے ہیں:

صحراؤں میں، گلشن میں، خلاؤں میں جبل میں کیوں پھرتے ہیں جوگی بنے ہم سے تو کبھی پوچھ
ٹھہراتا ہے بس مورد الزام ہمیں کو ہے کس کی خطا اہل کرم سے تو کبھی پوچھ عارفؔ

مدھیہ پردیش اردو اکادمی کی روح رواں محترمہ نصرت مہدی صاحبہ ایک اچھی شاعرہ ہیں۔ ان کا کام تصوف پر ہے۔ ان کے کلام میں تصوف کا رنگ دیکھیے:

وہ معترف ہے جنوں میں فنا پسندی کا تو خود کو خاک کیا رائیگاں بنا لیا ہے ڈاکٹر نصرت مہدی

ممبئی کے شاعر فرحت احساس لکھتے ہیں:

کس کی ہے یہ دھول میرے تصوف کے پاؤں میں کیا ہے یہ خانقاہ کے در پر پڑا ہوا

زاہد وارثی برہان پوری کہتے ہیں:

تری توصیف نے بخشا مرے لہجے کو وجود تری تمثیل مرے حسن بیاں تک پہنچی

پنجاب پاکستان کے شاعر نصیر الدین نصیر گولڑوی کہتے ہیں:

دین سے دور نہ مذہب سے الگ بیٹھا ہوں تری دہلیز پہ ہوں سب سے الگ بیٹھا ہوں

اس طرح اردو شاعری میں رنگ تصوف سے مزین انگنت اشعار ملتے ہیں۔ تقریباً سب

ہی شعراء نے تصوف اور فلسفے کو اپنے اپنے طرز و انداز میں بیاں کیا ہے۔مختصر یہ کہ اردو شاعری میں یہ ایک مضمون تصوف سوڈھنگ سے باندھا گیا ہے۔تصوف کے ان تخیلات کے گلہائے تر سے اردو کا چمنستان شاعری مہک رہا ہے۔مضامین تصوف کی کثرت پھولوں کے بے شمار رنگوں اور اشکال کی طرح اردو شاعری میں نظر آتی ہے۔ان تمام اشعار کو یکجا کیا جائے تو ایک ضخیم کتاب تیار ہو سکتی ہے۔

کتابیات:

1۔تصوف اور اردو کی صوفیانہ شاعری،ڈاکٹر مرزا صفدر علی بیگ،دہلی،جون ۱۹۸۶

2۔تاریخ اولیائے کرام برہان پور بشیر محمد خان ایڈوکیٹ،برہان پور ،جنوری ۱۹۹۷

3۔ برہان پور کی اردو شاعری پر دبستان لکھنو کے اثرات،ڈاکٹر عارف انصاری،برہان پور فروری ۲۰۱۸

4۔کلیات سراج ،سراجؔ اورنگ آبادی ،قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان،نئی دہلی ،دوسرا اڈیشن ۱۹۹۸

5۔میرؔ،دردؔ،غالبؔ،اصغر گونڈوی ۔۔۔۔وغیرہ شعراء کے اشعار ریختہ ڈاٹ کام

☆☆☆

Kashmiri Sufi Shairi ka Matni Mutala by Dr. Nisar Ahmad Bhat "Nadeem" (Kulgam) cell-7006249819

ڈاکٹر نثار احمد بٹ ندیمؔ (کلگام)

کشمیری صوفی شاعری کا متنی مُطالعہ

کشمیری صوفی شاعری درس دنیا میں ادبی طور پر کھنے اور سراہنے کے لائق ہے۔اگر چہ کشمیر زبان کا ادب کُلہم طور پر بہتر ہے مگر صوفی شاعری اپنے فلسفہ اور فکر سے ساری دُنیا میں منفرد مقام رکھتی ہے۔صوفی فکر اور فلسفہ کا معراج ہونے کے ساتھ ساتھ اس میں تخیلی اور تخلیقی فن کا نُمایا اور قابل قدر نُمایش ہے۔اگر چہ عالمی سطح پر پڑھنے والوں کا دھیان کشمیری ادب کی اور جاتا ہے اسکی وجہ کشمیری زبان کی لسانی انفرادیت کے بعد کشمیری صوفی شاعری ہے۔یہاں کشمیر میں اکثر انگریزی کے طالبِ علم یا سنجیدہ ادب نواز کبھی کبھی وجودی بہران کے شکار ہو کر کبھی منکرِ زات اور کبھی منکر صفات ہو کر پریشان ہوجاتے ہیں۔اور پھر وہ یہاں کشمیری صوفی شاعری کا دامن پکڑ کر نہ صرف اپنے سوالوں کے جواب پاتے ہیں بلکہ ذات وصفات کے ایمان کا اثبات بھی پالیتے ہیں۔میں ذاتی طور ایسے بہت سارے اشخاص سے مُلاقی ہوں۔کشمیر چونکہ ایک بہت پرانی سرزمین ہے اور یہاں قدیم زمانے سے مُختلف فلسفے پلے بڑے ہیں اور خاص طور پر یہ سرزمیں علم و ادب اور روحانیت کی گھوارہ رہی ہے۔یہاں آ کر تمام روحانی فلسفوں نے عروج پایا ہے۔اور ان روحانی فلسفوں اور تجربوں کی پوری داستان کی دلیل کشمیری صوفی شاعری میں آج بھی دیکھنے کو ملتی ہے۔کشمیری صوفی شاعری میں روحانی فلسفوں کا ایک تجرباتی بحث ملتا ہے۔کشمیری صوفی شاعروں نے ایک دوسرے سے تقابلی طور پر راہ سلوک کا دروں بینی سے مُطالعہ کیا ہے۔کشمیری صوفی شاعری میں کہی کہی دُنیا کے باقی صوفی تجرُ بات سے ہم خیالی ملتی ہے اور کہی پہ انفردیت اور عروج بھی نظر آتا ہے۔

یہ تمحید اس لئے پیش کرنی پڑی تا کہ یہ بات زہن نشین رہے کہ کشمیری صوفی شاعری کی ترتیب یا تدوین کے دوران مُختلف روحانی فلسفوں کا تقابلی مُطالعہ ہونا ضروری ہے۔بحر حال میں جب صوفی شاعری کا مُطالعہ کرتا ہوں تو کشمیری صوفی شاعری کو ایک گہرے مُطالعے کی طلبگار پاتا ہوں۔چونکہ اکثر صوفی شاعری تو سینہ بہ سینہ، نسل درنسل یا ثانوی ماخذوں سے موصول ہوی ہے

جن میں کشمیری گلوکار اور تیز قوتِ حافظہ والے مُرید شامل ہیں جو کہ اکثر اُمی ہی گزرے ہیں لہذا متن تحریر کرتے وقت لفظوں کے ادل بدل کا اہتمال زیادہ رہا ہے۔اس مقالے میں یہاں پر اگر میں کسی ترتیب کار کا مثال کے طور پر اپنی بات رکھنے کیلیے حوالہ دوں ،تو وہ نقطہ چینی کے بجائے نُقطہ بینی ہوگی۔حالانکہ کشمیری صوفی ساعری ترتیب دیتے وقت ،ترتیب کار کو جس کھٹن والی مشقت سے گزرنا پڑا ہوگا اُس کا مجھے شُدت سے اعتراف ہے۔مگر کشمیری صوفی شاعری کے چھاپ شدہ متن کا جب جایزہ لیتے ہیں تو کلام میں ایسے الفاظ کی غلطیاں نظر آتی ہے جو خاص مقاموں کے نُقطوں کی عمارت ہی گرا دیتے ہیں۔چونکہ اکثر صوفی شاعری ترتیب دینے والے یا تو خود صوفی تجربوں سے ناواقف ہیں یا کسی دوسرے سلسلے سے وابستہ ہیں اور شاعری کسی دوسرے سلسلے کے صوفی شاعر کی ترتیب دی ہے۔اور جہاں پے اصل متن کے الفاظ نہ ملے وہاں اپنی عقل کے قیاس کے مُطابق الفاظ کی برپایی کی۔چونکہ اکثر کشمیری نقاد اس بات کی رٹ لگایے بیٹھے ہیں کہ سارے کشمیری صوفی شاعر ایک ہی سالکانہ راہ پہ چلے ہیں اور ہر مُقام کیلیے ایک ہی طرح کی اصطلاحیں استعمال کی ہیں۔جو کہ صد فیصد صحیح نہیں ہے۔اسلیے جہاں پر کسی کو کسی شعر کا لفظ صحی طریقے سے پڑھنا نہیں آیا کسی دوسرے صوفی شاعر کا کویی ہم خیال مصرے کا لفظ وہاں پر قیاساً ڈال دیا۔ہاں یہ بات صحیح ہے کہ زِکروں فکروں اور زیر و بم اور سبا سماوات تک کے مقاموں تک کچھ صوفی شاعر یکسان نظر آتے ہیں مگر کشمیر کے شہسوار صوفی شاعر جب سالکانہ راہ کے شنیاہ سے گزرتے ہُوے صدرت المنتہا سے آگے پرواز کرتے ہیں تو تجرُبے اور اظہار کی ندرت نظر آتی ہے۔لیکن جب ایسے صوفی اشعار کے الفاظوں کی خلت ملت ہوتی ہے تو اس عروج کی پرواز ایک دم نیچے گر جاتی ہے۔مثال کے طور پر میں نے چند صوفی شاعروں کے کچھ اشعار کا متنی جواز پیش کروں گا۔اور جس کتاب سے میں نے ان اشعاروں کا انخواب کیا ہے وہ ہے''کشمیری صوفی شاعری جُلد ایک۔'' مرتب موتی لال ساقی ،جموں کشمیر اکیڈمی آف آرٹ کلچر اینڈ لینگویجز،سرینگر،اس کتاب کا انخواب میں نے اسلیے کیا کیوں کہ یہ جموں و کشمیر کے سب سے بڑے اور زمہ دار ادارے نے اجرا کی ہے۔سب سے پہلے میں شمس فقیر کے کلام سے مثال پیش کروں گا۔شمس فقیر کشمیری صوفی شاعری کا تاج مانا جاتا ہے اور اس بات کا اعتراف خود کشمیر کے صوفی شاعروں نے کیا ہے۔

فناسپدتھ یہ کسرت بے وحدت تہ وحدانیت
بہ درحارت گوس حارانے بہ کہنے کس ونے پانے

مزکورا کلام شمس فقیر صاحب کے نُمایندہ کلاموں میں سے ایک ہے۔او پر جس انفرادیت کا زکر ہوا، اس کلام سے وہ بات ظاہر ہوتی ہے۔اس کلام میں ایک طرف زکروں کی نفی اور دوسرے طرف کسرتِ سوزِ دروں کی نفی ہے جس میں کبھی شمس فقیر یا کویی صوفی گنگروں کا گٹھا باندے داخل ہوا تھا۔ بلکہ اس میں وحدت اور وحدانیت کی بھی نفی ہے اوور سالک عالم حیرت میں اُس زات کی تلاش میں ہے جس کا کویی نام نہیں ہے۔ بحر حال دراصل شعر کا صل متن یہ ہے۔

ژتر او کسرت ، یہ چھے حسرت — بے وحدت تہ وحدانیت
بہ درحارت گوس حارانے — بہ کہنے کس ونے پانے
انہِ گٹہِ گرٛھہِ کنہِ پھٹرُ نیے — اژدھامنز لال کھالنیے
زال ژانگہِ مازکھیو پٹنُنے — رندسر ہوسپدی اونیے

اصل: انہِ گٹہِ گرٛھہِ کنہِ پھٹرُ نیے — اژدھاپھرِ لال گرٛھہِ کھالنیے
زال ژونگ مازکھیو پٹُنیے — رندسر ہوسپدی اونیے

اژدھاپھرِ یعنی اژدھا کے بطن سے جوہر نکالنا ہے۔

رسہ رسہ پانس چوان مشکہ گل یے — اسہِ چھُنہ چاوان کیا چھُسون پاے
مس گے مستان مس چیتھ ول یے — لل یے کر سے للہ متہ لاے

اصل: رسہ رسہ پانس چوان مسہ گل یے — کیونکہ مس یعنے مے پیا جاتا ہے نکہِ مشک۔

داے شو بیا مختہ ہار پخنتہ کارژل یے — شاہ شمس رُمہ ریش نُے آے
مایہِ پننہِ داستان وونے گاٹل یے — لل یے کر سے للہ متہ لاے

اصل: داے شوٗ بیایہِ مختہ ہار نل یے

یعنی دایی (فکر) کو تھوڑی موتی کا ہار جچتا ہے۔ بلکہِ پُختہ کار تھوڑی با گتے ہیں۔اسلیے ایسا کہنا غلط ہوگا۔

شمسہ آژ درِ کن س پد کھ گیانی — دلکُے برمُژ راو
آفتا بک پاٹھ پھیر آسمانی — آگُر کمہِ نِش دراو

اصل: شمسہ آژ دُرِ کن سپد کھ گیانی

دُر یعنی موتی اور کشمیری میں چھوٹی ندی پر بنے ایسے مچھلی پکڑنے کے جال کو کہتے ہیں جس میں دو پتھر ایسے رکھے جاتے ہیں کہِ ان میں سے گُزر کر مچھلی پھس جاتی ہے۔اس شعر میں اس لفظ سے ایہام کاری پیدہ ہوتی ہے۔ کچھ صوفی اس لفظ کو ''در کن'' یعنی کان کے اندر سے جانا بھی کہتے ہیں۔ جو صوفی

نکتہ بینی کے لحاظ سے صحیح ہے مگر شعر کے فنی اور کثیر الجہت معنے پیدہ کرنے کی قوت نہیں رکھتا ہے۔ دوسرا یہ سارا کلام پانی کے متعلق استعاروں پر مبنی ہے۔

وُچھم دیدو بوزم کنے   یا یارو بہ کیاونے

اصل: وُچھم نہ دیدو بوزُم نہ کنے   ہا یارو بہ کیاونے

یعنی وہ ایسی زات ہے جسے نہ آنکھو سے دیکھا جا تا ہے اور نہ کانو سے سُنا جا تا ہے۔ اکثر لوگ دیکھنے اور سُننے کو اس لیے صحیح مانتے ہیں کیونکہ اُن کے نزدیک وہی بڑا مُقام ہے۔ جبکہ نہ دیکھنا اور نہ سُننا سمیع بصیر کے مقام کے بعد کا مقام ہے جو کہ اصلی تصوف ہے۔ جس کے بارے میں حدیث مبارک میں بھی اشارہ ہے جب آنحضرتؐ سے عرض کیا گیا کہ کیا آپؐ نے خدا دیکھا تو آپؐ نے فرمایا کہ آپؐ نے جبرائیلؑ کو دیکھا۔ اسلیے نہ دیکھنا اور نہ سُننا ہی صحیح ہے۔

مئ چھُوی اندر نبرے پے   توے گوگل شیٔاَئ   رحیم صاحب سوپورئ

اصل: مئ چھُوی اندر نبرے پے   مئ گوگل شیٔاَئ

یعنی ارشاد باری تعلیٰ ہے کہ ہر شے پانی سے ہی پیدہ کیی گیی ہے۔

سوز عشقن بہ کیاونے   بوزوُن چھکھ بہ کیاونے

اصل: سوز عشقن بوز کنے   بوزوُن چھکھ بہ کیاونے

تورے شاہ یے لہِ دراوٹھوُلس   ھوتہ اللہ تتھ اوسیے   سچھ کرالؔ

اصل: یورشاہ کتہِ ژاپوٹھوُلس   ھوتہ اللہ اتھ منز چھُیے

راہ اوسُے نہ عزرایلس   باخبر سہُ اوسیے

پراہ چھُ شانتِس کران شلس   روبلس کیاوچھِ یے

اصل: راہ اوسُے نہ عزازیلس   باخبر سُے اوسیے

پراہ کورنس شانتس تہ شلس   روبُلس کیاوچھِ یے

زیروبم چھُے ڈولمُت ووصوُلس   سِر بہ انے کس باویے

اصل: زیروبم چھُے ڈولمُت ووصوُلس   سِر پننُے کس باویے

موٗ دمُشتاق بالس تہ موٗلس   روٗ دکتہِ تم شیے طرفیے   سچھِؔ (صوفی شاعری جُلد اصفہ ۸۷)

اصل: موت چھُ مشتاق مالس تہ موٗلس   رُوٗ دکتہِ تم شیے طرفیے

خودی تراوِتھ لاہوٗت سرتو   سرتو اللہ ہو   ص۔ش (جلد اصفہ ۹۰)

اصل: خودی تر اوتھ لاحدی سرتو سرتو اللہ ہو

سمیع السماوات پچھے کُنز چھکھے عاشق تر اوانز ص۔ش۔(جلد ا صفہ ۱۹۵)

اصل: سبا سماوات پچھے کُنز چھکھے عاشق تر اوانز

از سینہ نبی کتھ یےلہِ درایہِ شاد گے شاہ ولایت

زونے اس تتھ پھیر ہر شایہِ لگیوژ ھایہِ بامدنو

(نوٹ: مزکورہ اہم شعر کلام میں درج ہی نہیں ہے) ص۔ش۔(جلد ا صفہ ۱۹۳)

ہے سندری جودوگری شاہ سندری

اصل: ہے سندری جودوگری سندری لعل مرجان سندری

صورت کم دِژی صورت گری تس چھاپیہِ کینہہ

اصل: صورت کم دِژی صورت گری تس چھاپیہِ کِنہ یژی بس

کت مار چان نستہِ خنجری ونجری بُمہ چانہِ زن چھے تار

اصل: کت مار چان نستہِ خنجری ونجری بُمہ چانہِ زن چھے تلوار ص۔ش۔(جلد ا صفہ ۲۰۱)

گرِ یہ درایس درد کہِ دیشہ پردن ژھایہِ تھوؤم روے

درد چھے نیک مردن نیشہِ کمیو شیشہِ چونس مے

(مزکرہ شعر کلام میں درج ہی نہیں ہے) ص۔ش(جلد ا صفہ ۲۰۸)

چھس بہ پرران کلہ وال کرمس دِیے چتھ چوان گے درطلب رؤ زتھ یے

مرتھ، ہشرتھ زندرؤ دس پتھ نیے گاہ مے منزنے گاہ بہ اوسُس منز نیے

شبہ شبے برچمن پُرچھیے زانہِ سومبل یس یہِ گدر یومُت چھُیے

(نوٹ: مزکورہ تین شعر بھی کلام سے غایب ہے) ص۔ش۔(جلد ا صفہ ۲۲۰)

بہرِ نعمہ مارنے آوحشمہ سان صد سپا سالا رداری اے کریم

اصل: بہرِ نعمہ مارنے آوحشمہ سان صد سپا سالا رداری اے کریم

بحر حال یہِ چند مثالیں جو میں نے اس کتاب سے پیش کی تا کہِ ایک تحقیقی کام نیے سرے سے کشمیری صوفی شاعری کے متن کے حوالے سے شروع کرنے کی سوچ پیدہ ہو جایے اور کشمیری صوفی شاعری کے متن کا اصل نمونہ پیش کیا جایے۔

☆☆☆

Raees Ahmad Kumar ki Afsancha Nigari by Muzamil Hamid
(Research Scholar. Desh Bhagat University,Mandi Gobind Garh)
مزمل حمید (ریسرچ اسکالر، دیش بھگت یونیورسٹی، منڈی گوبند گڑھ، پنجاب)

رئیس احمد کمار کی افسانچہ نگاری

رئیس احمد کمار ریاست جموں کشمیر کے علمی و ادبی حلقوں میں کالم نویس کے طور پر جانے پہچانے جاتے ہیں۔لیکن کالم نویسی کے ساتھ ساتھ آپ افسانچہ نگاری اور افسانہ نگاری میں بھی دلچسپی رکھتے ہیں۔جس کے نتیجے میں آپ کے افسانوں و افسانچوں کا ایک مجموعہ ''تسکینِ دل'' کی شکل میں شائع ہو چکا ہے۔آپ نے قلمی سفر کا آغاز بطور کالم نویس کیا۔''تسکینِ دل'' کے فلیپ پر آپ کی کالم نویسی کے متعلق یہ نوٹ چسپاں ہے:

''رئیس احمد کمار اردو اور انگریزی روزناموں کے لیے مسلسل کالم لکھتے رہتے ہیں۔ان کے کالم بیرونی ممالک کے روزناموں اور ہفتہ وار اخبارات اور جرائد میں بھی شائع ہوتے رہتے ہیں۔موصوف کے کالم مختلف سیاسی، سماجی، علمی، ادبی، اخلاقی، تہذیبی اور ثقافتی نوعیت کے ہوتے ہیں۔ان کے کالموں کی سماجی اور ادبی حلقوں میں پذیرائی ہوتی ہے۔'' (افسانے و افسانچے ''تسکینِ دل''، فلیپ کور)

رئیس احمد کمار کی پیدائش اپریل ۱۹۸۴ء میں بری گام، قاضی گنڈ، کشمیر میں عبدالعزیز کمار کے ہاں ہوئی۔مقامی اسکولوں میں ابتدائی تعلیم حاصل کرنے کے بعد گورنمنٹ ڈگری کالج بوائز کھنہ بل، اننت ناگ، کشمیر سے بی ایس سی کی۔اس کے بعد کشمیر یونیورسٹی سے بی ایڈ کی ڈگری حاصل کی۔اس کے بعد اندرا گاندھی اوپن یونیورسٹی دہلی اگنو سے پولیٹیکل سائنس میں ایم۔اے اور ماحولیاتی سائنس میں ایم ایس سی کی ڈگریاں حاصل کیں۔درس و تدریس کو روزگار کا ذریعہ بنایا۔جولائی ۲۰۰۹ء میں ریاست جموں کشمیر کے محکمہ تعلیم سے وابستہ ہو گئے اور گورنمنٹ بوائز ہائی اسکول خانن کنگن ضلع گاندربل میں بطور مدرس خدمات انجام دینے لگے۔پچھلے ۱۴ سال سے اسی ادارے سے وابستہ ہیں اور گاندربل کے مختلف اسکولوں میں تعلیمی خدمات انجام دے چکے ہیں۔مستقل طور پر کمار محلہ، بری گام، قاضی گنڈ میں رہائش پذیر ہیں۔رئیس احمد کمار نے اردو اور انگریزی میں کالم نویسی کے

ذریعے بطور صحافی اپنے قلمی سفر کا آغاز کیا۔ آپ کے کالم خطہء کشمیر کے اردو کے اہم اخبارات جن میں سرینگر جنگ، کشمیر ریز، سرینگر میل، اڈان، نگران، تعمیل ارشاد، کشمیر ٹربیون، کشمیر عظمیٰ، ویتھ، لازوال، نیا نظریہ اور صحافت وغیرہ میں شائع ہوتے رہتے ہیں۔ اسی طرح انگریزی میں رائزنگ کشمیر، کشمیر وجن، برائٹر کشمیر، کشمیر تھنڈر، کشمیر ہاریزن، گوڈ مارننگ کشمیر، اقبال کشمیر، مرر آف کشمیر، کشمیر کنویز، کشمیر امیجز، گریٹر کشمیر، پریشیس کشمیر، سٹیٹ کشمیر، پارلیمنٹ ٹائمز، فائنانشل ڈیلی انٹرنیشنل، سسٹم، طالب نظر، کشمیر ریڈر، کشمیر ایج، ایرلی وغیرہ اخبارات کے نام قابل ذکر ہیں۔

اردو کے نامور افسانہ نگار سعادت حسن منٹو دسویں کلاس میں اردو میں فیل ہو گئے تھے لیکن اس کے باوجود ان کو اردو کا سب سے بڑا افسانہ نگار ہونے کا شرف حاصل ہے۔ منٹو کے برعکس رئیس احمد کمار نے دسویں تک اردو پڑھی ہے اور آپ دسویں تک اردو پاس ہیں۔ چونکہ آپ نے گریجویشن میں سائنس سبجیکٹ منتخب کیا تھا۔ اس وجہ سے تعلیمی طور پر آپ کا اردو سے رابطہ ختم ہو گیا۔ لیکن رئیس احمد بچپن سے ہی اردو سے وابستہ تھے اور اردو سے رغبت کا یہ سلسلہ آج بھی برقرار ہے۔ اردو اور انگریزی میں کالم نویسی اور مضمون نگاری کے ساتھ ساتھ آپ نے افسانہ نگاری اور افسانچہ نگاری کو اپنے اظہار کا وسیلہ بنایا۔ اس ضمن میں موصوف خود رقم طراز ہیں:

''میں نے میٹرک کا امتحان ۱۹۹۹ء میں پاس کیا ہے اس کے بعد میں نے انٹرمیڈیٹ اور پھر گریجویشن میں سائنس بطور مضمون اپنی مزید تعلیم حاصل کرنے کے لیے اختیار کی۔ اس لیے اردو بحیثیت مضمون اگرچہ میں نے بعد میں نہیں پڑھی ہے۔ لیکن اردو سے میری رغبت بچپن سے ہی رہی ہے آج بھی اس میں کوئی تبدیلی نہیں آئی ہے بلکہ روز بہ روز اس زبان کے ساتھ دلچسپی بڑھتی ہی جا رہی ہے۔ پہلے پہل جب میں نے اپنے مضامین، کالم اور افسانے ریاست اور بیرون ریاست کے نامور روز ناموں، رسالوں اور جرائد میں شائع ہونے کے لیے بھیجے اور بعد میں متواتر طور پر شائع بھی ہوتے رہے تو میری سوچ میں ایک مثبت تبدیلی رونما ہوئی کہ میں بھی اردو زبان میں کوئی کتاب تحریر کروں۔''

(ایضاً پیش لفظ، ص ۸)

رئیس احمد کمار نے اردو میں کالم بھی لکھے ہیں، افسانے اور افسانچے بھی۔ موصوف کے افسانے اور افسانچے مختلف اخبار و رسائل کی زینت بن چکے ہیں۔ اس کے علاوہ آپ کا ایک افسانوں و افسانچوں کا پہلا مجموعہ ''تسکین دل'' کے عنوان سے ۲۰۲۲ء میں منظر عام پر آچکا ہے۔ ''تسکین دل'' کمار کی شائع ہونے والی واحد کتاب ہے جبکہ آپ کی اب تک انگریزی میں مندرجہ ذیل تین کتب

شائع ہوچکی ہیں:

1. Noble Thoughts (Collection of English Columns)
   Wullar Publishing House, Kashmir 2021
2. Karl Koor / Potter's daughter (English Novlet)
   Inkliks Publishing House, Kashmir 2022
3. Silent Voices (English Poetry Collection)
   Shrihind Publications India Ltd, 2023

رئیس احمد کمار نے ''تسکین دل'' کے آغاز میں پیش لفظ شامل کیا ہے۔جس میں موصوف نے اپنے صحافتی و ادبی سفر کے متعلق روشنی ڈالی ہے۔اس کے علاوہ کمار نے اس کتاب کا انتساب اپنے والدین، بیٹی اور دادا مرحوم کے نام کیا ہے۔دیکھا جائے تو انتساب میں احترام کے طور پر پہلے دادا کا نام، پھر والدین اور آخر میں بیٹی کا آنا چاہئے تھا۔قابل ذکر ہے کہ موصوف نے روایت سے احتراز کرتے ہوئے افسانوں وافسانچوں کے مجموعے پر کسی نقاد یا سینئر افسانہ نگار سے کچھ نہیں لکھوایا ہے۔اس کتاب کی ایک اور بے ترتیبی افسانے وافسانچے آپس میں گڈ مڈ ہیں یعنی افسانے وافسانچے الگ الگ شائع نہیں کئے گئے ہیں۔گنتی سے پتہ چلتا ہے کہ اس کتاب میں ۱۳،افسانے اور تقریباً ۲۷ افسانچے شامل کئے گئے ہیں۔رئیس احمد کمار کے بیشتر افسانچے ایک صفحے پر مشتمل ہیں۔لیکن کتاب کے صفحات بڑھانے کے لئے ہر افسانچے کو دو صفحات پر پھیلایا گیا ہے۔کیونکہ افسانچے میں افسانچہ نگار کو نہایت اختصار کے ساتھ اپنی بات کہنی ہوتی ہے۔موصوف افسانچہ نگاری کے اس اصول سے بخوبی واقف ہیں۔یہی وجہ ہے کہ انھوں نے واقعات کو کم سے کم الفاظ میں پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔افسانچوں کے ساتھ ساتھ موصوف کے تحریر کردہ افسانے بھی زیادہ طویل نہیں ہیں۔افسانچہ نگاری کا دوسرا اہم وصف موضوع ہے۔یعنی افسانچے کا موضوع اچھوتا اور نیا ہونا چاہئے۔رئیس احمد کمار چونکہ اس میدان میں نئے ہیں اس لئے وہ اچھوتے اور نئے موضوعات ڈھونڈنے میں زیادہ کامیاب نہیں ہوئے ہیں۔انھوں نے اپنے اردگرد بکھرے ہوئے سماجی ،معاشی تعلیمی اور سیاسی موضوعات کو افسانچوں کے لئے منتخب کیا ہے۔بڑھاپا زندگی کی آخری منزل ہے۔دیکھنے میں آیا ہے کہ موجودہ دور کے بیشتر پریوار بوڑھے افراد کو اپنے لئے بوجھ سمجھنے لگتے ہیں۔پریوار کے علاوہ کئی بار جیون ساتھی بھی اپنے کمزور لائف پاٹنر سے اکتا جاتا ہے۔انسانی رشتوں کے بدلتے ہوئے اس پہلو کو

رئیس احمد کمار نے اپنے افسانچے ''بڑھاپا'' کے ذریعے پیش خدمت ہیں۔ افسانچے کے ابتدائی جملے پیش خدمت ہیں:

''کتنا پریشان کرتا ہے یہ۔ سبزی میں نمک زیادہ، چائے میں نمک کم، چاول زیادہ نرم اور دوائی اچھی نہیں لاتے ہو۔ بس ہر روز ہمیں یہی سننا پڑتا ہے۔ ایسی زندگی سے اس کے لئے موت ہی بہتر ہے۔ خود بھی پریشان اور گھر کے باقی افراد کو بھی خواہ مخواہ پریشانی میں ڈال دیتا ہے۔۔ ہائے کتنا تنگ مجھے اور میری بیٹیوں کو اس نے پچھلے دو سال سے کیا ہے۔ یا اللہ کب ہمیں اس ستم سے آزادی ملے گی۔ کب تم اسے اپنے پاس بلاؤ گے۔'' جبینہ باورچی خانے میں کھڑی اپنی بیٹیوں سے مخاطب تھی۔ (ایضاً، ص ۷۳)

اسی طرح افسانچہ ''شرمندگی'' ایک منفرد موضوع پر مبنی افسانچہ ہے۔ جس میں افسانچہ نگار نے انسانی سماج کے دو اہم پہلوؤں غریبی اور امیری پر روشنی ڈالی ہے۔ غریب آدمی کی باہر تو کیا گھر میں بھی عزت نہیں ہوتی۔ اسی وجہ سے وہ احساسِ کمتری کا شکار ہو جاتا ہے۔ جس کی وجہ سے وہ مسجد اور محلے کے فلاحی کاموں سے دور رہتا ہے۔ اس کے برعکس امیر آدمی مسجد اور محلے کی فلاحی کاموں میں پیش پیش رہتے ہیں۔ رئیس احمد کمار نے سماج کے اس پہلو پر ''شرمندگی'' کے عنوان سے ایک بہترین افسانچہ قلم بند کیا ہے۔ حالانکہ اس کا عنوان ''شرمندگی'' مناسب نہیں لگتا۔ اگر اس کی جگہ ''احساسِ کمتری'' تو زیادہ بہتر رہتا۔ افسانچہ ''شرمندگی'' پیش خدمت ہے:

مقبول اپنی تنگدستی اور غریبی کی وجہ سے ہر کسی کے سامنا کرنے میں اکثر شرم محسوس کرتا تھا۔ جہاں بھی پانچ چھ آدمیوں کا مجمع ہوتا تھا مقبول وہاں سے چوری چوری چلا آتا تا کہ ان سے بات نہ کرنی پڑے۔ جب بھی وہ مسجد سے گھر یا بازار سے گھر آتا تھا تو دائیں بائیں نظر دوڑائے بغیر سیدھے منہ چلا آتا۔ جب کسی رشتے دار یا ہمسایہ کی شادی یا تعزیتی تقریب ہوتی تھی تو مقبول وہاں جانے سے بھی گریز کرتا تھا۔ مقبول کے دو بیٹے جنہوں نے ریلوے محکمے میں انٹرویو دیا تھا۔ جب وہ سلیکٹ ہوئے تو تمام ہمسایہ اور رشتے دار مقبول کے گھر مبارکباد کے لئے آئے۔ اس کے بعد مقبول کی تنگدستی اور غریبی فوراً دور ہو گئی۔ مقبول کے رویے اور وطیرے میں بھی تبدیلی آ گئی۔ تمام ہمسایوں، رشتے داروں اور مسجد میں باقی نمازیوں کے ساتھ بلا جھجک بات کرنے لگا۔ شادی اور تعزیتی تقریبوں میں خود شرکت کرنے کے علاوہ وہاں موجود لوگوں کے سامنے خطاب بھی کرنے لگا۔ اقبال، غالب اور دیگر دانشوروں کے اقوال سے ہمیشہ اپنی بات شروع کرتا تھا۔ لوگوں کی نظروں میں اب مقبول کی ایک

الگ شخصیت بن گئی۔۔ محلے کی مسجد کمیٹی اور گاؤں کی اوقاف کمیٹی نے اب مقبول کو لوگوں کی مرضی سے دونوں کمیٹیوں کا صدر بنانے کا منصوبہ بنایا۔ (ایضاً، ص ۷۵)

جب انسان کو مطلب ہوتا ہے تو اُسے بُرے لوگ بھی اچھے لگنے لگتے ہیں۔ اس نظریے کو کمار نے اپنے افسانے ''ووٹ'' کے ذریعے پیش کیا ہے۔ جبینہ کو رمضان خان کی حرکتیں پسند نہیں ہیں۔ اس افسانے کے ابتدائی جملے پیش خدمت ہیں: کتنا بدتمیز ہے وہ۔ تین بیٹیوں کا باپ ہونے کا احساس ہی نہیں ہے اس کو۔ اس عمر میں اتنی بڑی غلطی کرنے والا شخص تو درندہ ہی کہا جا سکتا ہے۔ ایسی غلطی کرنے والے شخص کو انسان نہیں کہتے ہیں۔ میں ہمیشہ اس کو بڑی عزت کی نگاہوں سے دیکھ رہی تھی لیکن وہ عزت کے لائق ہی نہیں ہے۔ (ایضاً، ص ۱۰۳)

لیکن اس کے بعد افسانچے میں تبدیلی ہوتی ہے۔ جبینہ میونسپلٹی کا الیکشن لڑتی ہے۔ اس موقع پر جبینہ کو رمضان خان جیسے بے غیرت انسان کے در پر بھی ووٹ کے لئے جانا پڑتا ہے۔ کہتے ہیں کہ الیکشن میں ایک ایک ووٹ بہت قیمتی ہوتی ہے۔ اس طرح افسانچہ نگار نے جبینہ کے دوہرے کردار کو پیش کیا ہے۔ جو وقت پڑنے پر بڑے لوگوں سے بھی مدد لینے سے گریز نہیں کرتی۔ افسانچے کے اختتامی جملے پیش خدمت ہیں:

''جبینہ بھی ان چھ امیدواروں میں شامل ہے جو ووٹ حاصل کرنے کی غرض سے ہر کسی سے منت سماجت کر رہی ہے۔ رمضان خان کے پاس ووٹ حاصل کرنے کے لئے جبینہ آئی ۔۔۔ میں تمہارے بغیر کسی کو ووٹ نہیں ڈالوں گا۔ میرا ووٹ صرف اور صرف تمہارے لئے ہے۔ اس بار بھی رمضان نے جبینہ کو چھیڑا مگر جبینہ نے اُف تک نہ کی اور ووٹ کی خاطر چپ چاپ بیٹھ گئی۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔'' (ایضاً، ص ۱۰۴)

اس مختصر سے مطالعے کے بعد ہم کہہ سکتے ہیں کہ رئیس احمد کمار نہایت سنجیدگی سے افسانچہ نگاری کی طرف راغب ہوئے ہیں۔ آپ کے افسانچے اقوال زریں، لطیفے یا پھر حکایت کے عیب سے پاک ہیں۔ موصوف کہانی کہنے کا ڈھنگ جانتے ہیں۔ لیکن رئیس احمد کمار کا ابھی اس فن میں مزید کمال حاصل کرنا باقی ہے۔ اس کے لئے انھیں اردو کے بہترین افسانچہ نگاروں کی تحریروں اور فن افسانچہ نگاری کے متعلق کتب کا مطالعہ کرنا ہوگا۔ تاکہ انھیں فن افسانچہ نگاری کیا صول وضوابط سے واقفیت حاصل ہو سکے۔ اُمید ہے کہ مستقبل میں ہمیں رئیس احمد کمار کی قلم سے کچھ اور کامیاب اور شاہکار افسانچے پڑھنے کو ملیں گے۔ اللہ کرے زور قلم اور زیادہ۔ ☆☆☆

Gaus "Khwah Makhwah" ki Mazahiya aur Shagufta Shairi by
Shihabuddin P (Research Scholar, Dept.of Urdu, Mysore university)
شہاب الدین پی (ریسرچ اسکالر، شعبہ اردو، میسور یونیورسٹی، میسور)

غوث خواہ مخواہؔ کی مزاحیہ اور شگفتہ شاعری

اردو کے مشہور مزاحیہ شاعر غوث محی الدین احمد، غوث خواہ مخواہؔ کے نام سے جانے جاتے ہیں۔ ان کی پیدائش 17 اپریل 1930ء کو حیدرآباد میں ہوئی۔ ان کی پیدائش کے تین سال بعد ان کی والدہ فاطمہ النساء کا انتقال ہوگیا۔ اس لیے ان کے والد محمد یوسف نے ہی غوث خواہ مخواہ کو باپ کی محبت کے ساتھ ماں کا پیار بھی دیا۔ غوث خواہ مخواہؔ کی تعلیم حیدرآباد میں ہوئی۔ انٹرمیڈیٹ کے بعد فوراً ہی ان کو ملازمت مل گئی۔ 1948ء میں پولیس ایکشن کے بعد انھوں نے اپنا وطن حیدرآباد چھوڑ کر تلاشِ معاش کے سلسلے میں بمبئی کو گئے۔ وہاں جا کر انھوں نے مراٹھی زبان بھی سیکھ لی۔ بمبئی میں ملازمت کے لیے بھٹکتے رہے، آخر کار لاچار ہو کر حیدرآباد لوٹ آئے۔ بعد جے جے اسکول آف آرٹس سے ڈرافٹ مین شپ کا ڈپلوما حاصل کیا۔ 1956ء میں حیدرآباد کے محکمۂ تعمیراتِ عامہ میں بحیثیت ڈرافٹ مین ان کا تقرر عمل میں آیا۔ چار ماہ بعد جب لسانی بنیادوں پر ریاستوں کی تقسیم عمل میں آئی تو غوث خواہ مخواہؔ کا تبادلہ بھی بمبئی مہاراشٹرا کر دیا گیا، جہاں وہ محکمہ برقی آبپاشی میں ڈرافٹ مین کے عہدے پر فائز رہے اور بالآخر وظیفۂ حسن خدمت پر سبکدوش ہوئے۔ وظیفہ یابی کے بعد بمبئی سے اپنے آبائی وطن حیدرآباد لوٹ آئے اور تادمِ مرگ یہیں مقیم رہے۔

غوث خواہ مخواہ کی ادبی زندگی کا آغاز ممبئی میں دورانِ ملازمت روزنامہ 'انقلاب' میں 'خالی پیلی' کے عنوان سے کالم لکھنے سے ہوا۔ غوث خواہ مخواہؔ کا اصل میدان شاعری تھا۔ ان کی مزاحیہ شاعری سن کر سنجیدہ لوگ بھی قہقہہ لگانے پر مجبور ہوتے تھے۔ وہ اپنے منفرد مزاج سے سامعین کے دل کو قابو کر لیتے تھے۔ ان کے مزاحیہ اشعار نہ صرف مشاعروں کی جان تھی بلکہ عمدہ مزاح نگاری کی پہچان اور مشاعروں کی کامیابی کی ضمانت بھی تھے۔ غوث خواہ مخواہؔ صاحب کے تین شعری مجموعے بہ فرضِ محال (1992)، حرفِ مکرّر (1998)، کاغذ کے تیشے (2004) شائع ہوئے

ہیں۔غوث خواہ مخواہؔ نے بخود اپنی شاعری کے آغاز کے بارے میں اپنا شعری مجموعہ کاغذ کے تیشے مزاحیہ انداز میں کہتے ہیں کہ :

''طنز و مزح کا شوق ایک عجیب و غریب مرض ہے۔اس مرض میں مبتلا ہونے کے بعد، مریض ہنسنے ہنسانے کے کسی لمحے کو بھی ضائع ہونے نہیں دیتا۔ مجھ پر اس مرض کا پہلا حملہ 1954ء میں ہوا۔ ابتدا میں طبیعت سنجیدہ شاعری کی طرف راغب رہی اور پھر مرض میں دوسرے آثار یوں ظاہر ہونے لگے کہ اوقات فرصت میں جب مزاحیہ مضامین، انشائیے یا اشعار پڑھتا تو ذہن کی زرخیز زمین میں ظرافت کی ننھی ننھی کونپلیں پھوٹتی، پھر کلیاں نکل آتیں اور دیکھتے ہی دیکھتے سارا ذہن خوشبوئے ظرافت سے مہک اٹھتا۔ پھر یوں ہوا کہ

دعا کی نہ کسی سے التجا کی نہ ایک تعویذ لی رد بلا کی

یہ شاید ابتدا تھی انتہا کی "مرض بڑھتا گیا جوں جوں دوا کی'' (کاغذ کے تیشے،ص4)

غوث خواہ مخواہؔ نے اپنے شعر کہنے کی تحریک کی دو اہم وجوہات اس طرح بتائی ہیں:''میرے شعر کہنے کی تحریک دو وجوہات ہیں، ایک تو یہ کہ اپنی تحریر پڑھ کر سنتے ہوئے مجھے خوشی حاصل ہوتی ہے اور دوسری وجہ یہ ہے کہ میں دوسروں کو بھی اپنی طرح خوش دیکھنا چاہتا ہوں''

(بہ فرضِ محال ص۸)

غوث خواہ مخواہؔ نے سنجیدہ اور مزاحیہ شاعری دونوں کی ہیں۔ جہاں سنجیدہ شاعری کی ہے وہاں پر انھوں اپنا تخلص احمد کا استعمال کیا ہے، جب کہ مزاحیہ شاعری کے لیے خواہ مخواہؔ کا انتخاب کیا ہے۔ ان کے مجموعوں میں حمد، نعت، قطعات، غزل، مزاحیہ اور سنجیدہ نظمیں وغیرہ شامل ہیں۔ وہ اپنی شاعری کے ذریعہ سیاست، فسادات، حب الوطنی، ضعیفی، فیشن، ظرافت، شادی، خود داری، حسن و عشق، جہیز، حیدرآبادی تہذیب، مہنگائی وغیرہ کو بھی موضوع بنایا ہے۔ اپنی شاعری کے ذریعہ انھوں نے سماج کو، سیاست دانوں کو، لیڈروں کو آئینہ دکھانے کا کام کیا ہے۔موجودہ دور کے ایسے سیاسی لیڈران جن کے پاس ادب، اخلاق، اخلاص، رحم جیسی کوئی چیز نہیں ہیں، جو تاجوری اور اقتدار کے لیے غریبوں پر ظلم ڈھاتے ہیں، آپس میں لڑا کر بستیاں جلاتے ہیں، خونریزیاں کرواتے ہیں، لوٹ مار کی پشت پناہی کرتے ہیں، ان کو بھی خدا کی لاٹھی کی یاد دلاتے ہیں۔

غوث خواہ مخواہؔ کی حیات اور خدمات کا مطالعہ کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ انھوں نے ایک بامقصد زندگی گزاری۔ وہ سرکاری خدمات انجام دینے، طنزیہ و مزاحیہ شعر و شاعری کرنے، مشاعروں

میں شاعری پیش کرنے کے ساتھ ساتھ ہمیشہ دردمندوں اور ضرورت مندوں کو راحت پہنچا کر ایک نئی امیّد بخشنے کا کام بھی کرتے تھے۔خود ان کا ماننا بھی ہے کہ روتوں کو ہنسانا کسی کارِ خیر سے کم نہیں ہے۔

خواہ مخواہ کا ایک چوٗ املاحظہ فرمائیے، جس سے ان کے مزاج کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے:

چہرے پرمسرّت کے برسوں کی تھکاوٹ ہے　　دل میں کئی اَن دیکھے اندیشوں کی آہٹ ہے
کوئی بھی خوشی ہم کو خالص نہ ملی اب تک　　سوچا تھا زہر کھالیں اس میں بھی ملاوٹ ہے۔

ان کی ایک اور نظم ''لیڈر کا اسٹیچو'' ہے۔جس میں شاعر ایسے سیاسی لیڈروں کا، جنھوں نے جیتے جی لوگوں کی کوئی بھلائی نہیں کی، ان کا زندہ رہنا اور مرجانا دونوں لوگوں کے لیے بھوج اور تکلیف کا باعث بنتے ہیں، اس پر تبصرہ کیا ہے۔لوگ ایسے لیڈروں کی موت جلد آنے کے لیے دعائیں بھی کرتے ہیں، لیکن اس کی موت کے بعد بھی ان کا اسٹیچو بنا کر شاہ راہ پر نصب کر دیا جاتا ہے، اس کے لیے بھی پیسہ لوگوں سے ہی وصول کیا جاتا ہے۔نظم کی شروعات اس طرح کرتے ہیں:

جو طاقت اور حکومت کے نشے سے چور رہتا ہے　　وہ نیتا ہو کے بھی سب کے دلوں سے دور رہتا ہے
عوامی مسئلوں سے کوئی دلچسپی نہیں لیتا　　وہ چمڑی سب کی لیتا ہے مگر دمڑی نہیں دیتا
بلا سے اس کی مہنگائی اگر بڑھتی ہے تو بڑھ جائے
وہ کیوں سکھ اپنا چھوڑے اور ان دکھڑوں میں پڑ جائے
وہ ہوگا اور کوئی جو سب کا دکھ جو بانٹتا ہے　　یہ لیڈر اپنے سارے دکھ سبھوں میں بانٹ دیتا ہے

شاعر مزید کہتے ہیں کہ ایسے لیڈروں کی موت پر لاش کو کیا کرنا چاہیے، اور کیا ہوتے ہیں:

بہا دینا تھا بعد از مرگ سوکھی نہر میں جس کو　　کہ شکلِ بُت کھڑا کرتے ہیں قلبِ شہر میں اس کو

شاعر کو دکنی زبان اور حیدرآبادی تہذیب پر بڑی فخر تھیں۔ انھوں نے اس کا اظہار نظم ''چارسوسالہ حیدرآبادی تہذیب کے جشن'' پر پیش کیا ہے۔نظم کی شروعات اس طرح کرتے ہیں:

خواب ہے اور نہ کہانی ہے ہماری تہذیب　　نہ تو ٹھہرا ہوا پانی ہے ہماری تہذیب
لے چلے ساتھ بہا کے سبھی تہذیبوں کو　　ایسے دریا کی روانی ہے ہماری تہذیب

آگے انھوں نے حیدرآبادی تہذیب کی عظمت یعنی بزرگوں کی پروش، اردو کی ماضی کا کردار، دلکشی اور رنگا رنگی کا ذکر کیا ہے۔

بوڑھی لگتی ہیں اسے دیکھ کے سب تہذیبیں　　نئی دلہن کی جوانی ہے ہماری تہذیب
دن کے اوقات میں پھرتی ہے بنی شہزادی　　رات میں رات کی رانی ہے ہماری تہذیب

شاعری اور ادب کے ہیں خزانے اس میں بحرِ الفاظ و معانی ہے ہماری تہذیب
ختم ہوگی نہ کبھی خواہ مخواہؔ سنتے رہیے وہ پُراسرار کہانی ہے ہماری تہذیب

غوث خواہ مخواہؔ نے ہمیشہ اپنے ہم عصر شعراء کے ساتھ پرخلوص تعلقات رکھنے کے ساتھ ساتھ، شاعروں پر، ان کی زندگی کی تلخ حقیقت کی طرف بھی اشارہ کیا ہے۔ ان کی نظم ''ایک غریب شاعر کی موت پر'' اس کی بہترین مثال ہے۔ کہتے ہیں:

وہ شاعر اپنی خداداد صلاحیتوں کے باوجود غمِ روزگار میں بھٹکتا رہا، عمر گزرتا رہا۔ ان کے نام پر نہ کوئی دولت آئی اور نہ شہرت۔ آخر کار موت آ ہی گئی اور ان کی مشکلات اور زندگی کا بھوج موت کی وجہ دور ہوگئی۔ آخری شعر میں شاعر کہتے ہیں کہ:

افسوس کم ہوا مگر حیرت بہت ہوئی جب خواہ مخواہؔ عین ضعیفی میں مر گیا

یہ صرف کسی ایک یا دو شاعر و ادیبوں کی حالات نہیں ہیں، بلکہ تقریباً ہندوستانی ادیبوں کا یہی حال ہے۔ جنھیں اپنی صلاحیتوں کا صلہ اپنی زندگی بھر نہیں ملی۔ ان کی ایک آزاد نظم ہے ''امریکہ''۔ جس میں انھوں نے امریکہ اور ہندوستان کا تقابل کیا ہے۔ ہندوستان کے سرکاری افسر جو کسی نہ کسی بیماری کا بہانہ بنا کر کام پر جانے کے بجائے گھروں پر ہی آرام کرتے ہیں، جب کہ امریکہ کے افسران سوچتے ہیں کہ وہ آخر کس مرض میں مبتلا ہیں۔

''نئیں بولے تو سنتے نئیں'' خواہ مخواہ کی ایک مشہور مزاحیہ دکنی نظم ہے۔ جو مشاعروں کے ذریعہ بے حد مقبول بھی ہو گئے ہیں۔

دیکھو کِتّا سمجھا رَوں میں نئیں بولے تو سنتے نئیں اپنی من مانی تم کر رئیں نئیں بولے تو سنتے نئیں
کرنے کے جو کاماں ہیں وہ تو جیسے کے ویسے ہیں
نئیں کرنے کے کاماں کر رئیں نئیں بولے تو سنتے نئیں

ان کی ایک اور مشہور نظم ''لوگ'' ہے۔ اس میں شرابیوں کی عادات و اطوار کا بیان ہے:

دھوم مچی ہے میخانے میں پی رئیں اور پلائیں لوگ
گھر میں کھانے کو نئیں ہے پر جام پو جام چڑھا رئیں لوگ
میخانے کے اندر ہی قومی یکجہتی دِکھتی ہے دین، دھرم کو بھول کے دیکھو کیسا گھُل مل جا رئیں لوگ
کاش کہ ایسا منظر میخانے کے باہر بھی دِکھتا باہر تو بس اک دوسرے کے آنگ کے اوپر آ رئیں لوگ

امن اور شانتی کا نام لے کر ناانصافیوں کے خلاف آواز نہیں اٹھانے والوں کے انجام کی

طرف اشارہ کررہے ہیں:

لُٹ گیا سب چُپ بیٹھا تاکہ بستی میں امن رہے
اک جان بچی ہے خواہ مخواہ اب وہ بھی لینے آرہیں لوگ

ان کی ایک اور نظم ''سیاسی مصلحت'' ہے۔اس میں شاعر اپنے ملک میں بھی ہورہے سیاسی مصلحتوں اور عظیم، قابل شخصیتوں پر بھی کیے جانے والی ناقدریوں، ان دیکھی رویّوں پر طنز کیا ہے۔ ملاحظہ کیجیے:

ہے یہی دستور دنیا اور یہی دیکھا گیا پھول سے خوشبو، نکلتے ہی اسے پھینکا گیا
باغِ ہندوستان جن کے خون سے سینچا گیا دارِنا قدری پہ بالآخر انھیں کھینچا گیا
زندگی میں مل گئے کتنوں کو سرکاری خطاب مُفت میں اُن کو خریدا مُفت میں بیچا گیا

کبھی کبھار سیاسی مصلحتوں کے لیے بھی سرکاری خطابات و انعامات دیے جاتے ہیں، حقداروں کو محروم بھی کردیتے ہیں۔مولانا ابوالکلام آزاد جیسے مجاہدِ آزادی، صحافی، اسکالر، ادیب اور رہنما کو جن کی وفات 2فروری1958 میں ہوئی تھی، اس کے 34 سال بعد یعنی 1992ء میں بھارت رتن کا اعزاز دیا گیا۔اس نظم کا آخری شعر اس طرح ہے:

حضرت آزاد کو اعزاز بھارت رتن کا خواہ مخواہ ان کے پتے پر ڈاک سے بھیجا گیا

طنز ومزاح کے ذریعہ کسی شخص کو ہدف بنانے کو بھی وہ ناپسند کرتے تھے۔اس کا ظہار بھی انھوں نے اپنا شعری مجموعہ کاغذ کے تیشے کے مقدمہ میں اس طرح کیا ہے:

''پچھلے کئی برسوں سے عوامی مشاعروں میں، ملک کے سیاسی حالت کے پسِ منظر کو اپنی شاعری میں ہدف بنا کر کئی شعراء، عوام کے جذبات میں اشتعال پیدا کر کے داد وتعریف بٹورنے کی غرض سے سابقہ یا برسرِ اقتدار لیڈروں پر ان کے نام لے کر شخصی حملے کرنے لگے ہیں۔لیڈروں کی ناکامیوں پر طنز کرنا بجا ہے، لیکن کلم کھلا ان کے نام لے کر ان کی مجردانہ زندگی پر انھیں نشان ملامت بناتے ہوئے داد وصول کرنا، مشاعروں کی تہذیبی اور اخلاقی حدود سے متجاوز ہونے کے مترادف ہے۔''

(کاغذ کے تیشے، ص6)

غوث صاحب نے محاوروں، ضرب الامثال اور صنعتوں کا بھی استعمال خوب کیا ہے۔ مثال کے طور پر:

امجدؔ کی رباعی یا غالبؔ کی غزل جیسی یا جھیل کے پانی پر اک نیل کنول جیسی

ایک تاج محل شاید میں بھی بنا ہی لیتا ملتیں مجھے جو بیگم ممتاز محل جیسی (کاغذ کے تیشے ص ۲۵۱)

جس کی لاٹھی بھینس اسی کی آج کا بس قانون ہے یہ
کس کی شکایت کیسا مقدمہ کاں کی عدالت کیا بولوں (بہ فرضِ محال ص ۹۰۱)

غوث صاحب نے تحریف نگاری کے ذریعہ بھی شاعری میں مزاح پیدا کرنے کی کوشش کی ہے۔ علامہ اقبالؔ کا مشہور شعر

خودی کو کر بلند اتنا کہ ہر تقدیر سے پہلے خدا بندے سے خود پوچھے بتا تیری رضا کیا ہے

خواہ مخواہ صاحب نے اس طرح اس کی تحریف پیش کی ہے

شکم کو کر وسیع اتنا کہ ہر پکوان سے پہلے تجھے خود میزبان پوچھے بتا تیری غذا کیا ہے
(بہ فرضِ محال ص ۲۳)

الغرض غوث خواہ مخواہؔ ایک ہمہ جہت شخصیت کے مالک تھے، جنھوں نے ایک با مقصد زندگی گزاری۔ اندرون و بیرون ہندوستان میں منعقد ہونے والے کل ہند مشاعروں میں بارہا شرکت کرتے رہے، داد حاصل کرتے رہے۔

☆☆☆

Jammu Kashmir ka ek Munfarid Qalamkaar: Parvez Manoos by
Muzamil Hamid (Research Scholar, Desh Bhagat University
Mandi, Gobindgarh, Punjab)
مزمل حمید (ریسرچ اسکالر دیش بھگت یونیورسٹی، منڈی گوبندگڑھ، پنجاب)

جموں کشمیر کا ایک منفرد قلمکار: پرویز مانوسؔ

پرویز مانوسؔ کا شمار جموں وکشمیر کے دور حاضر کے اہم قلم کاروں میں ہوتا ہے۔ موصوف نے ادب کی مختلف اصناف میں طبع آزمائی کی ہے۔ آپ بیک وقت شاعر، افسانہ نگار، بچوں کے قلم کار اور مترجم کے طور پر جانے جاتے ہیں۔ اردو کے علاوہ کشمیری زبان پر بھی دسترس رکھتے ہیں۔ جس کا ثبوت آپ کے کشمیری سے اردو میں ترجمہ کردہ افسانے اور ناول ہیں۔ اس کے علاوہ ریاست جموں کشمیر کے منفرد افسانچہ نگاروں کی فہرست میں شامل ہیں۔ اصل نام پرویز احمد بٹ ہے آپ کا ابتدائی قلمی نام ''پرویز مایوسؔ'' ہے لیکن بعد ازاں آپ نے ''پرویز مانوسؔ'' کے قلمی نام سے لکھنا شروع کیا ۔ پرویز احمد بٹ کی پیدائش ۶، مارچ ۱۹۶۶ء کو چھانہ پورہ، سرینگر (جموں کشمیر) میں ہوئی۔ آپ کے والد غلام رسول بٹ فوجی تھے۔ کیونکہ آپ کے والد صاحب کی پوسٹنگ پونچھ میں تھی اسی وجہ سے پرویز مانوس کا بچپن پونچھ، جموں میں گزرا۔ آپ نے ابتدائی تعلیم پونچھ کے اسکولوں میں حاصل کرنے کے بعد ڈگری کالج پونچھ سے بی۔ اے کی ڈگری حاصل کی۔ بقول نور شاہ:

''پرویز مایوسؔ کا بچپن ریاست کے سرسبز اور شاداب علاوہ پونچھ میں گزرا اب وہ مستقل طور پر سرینگر میں قیام پذیر ہیں لیکن پونچھ کی ادبی زرخیزی اور رعنائی آج بھی ان کی تحریروں کی آبیاری کر رہی ہے۔ ادبی اور علمی تعلق سے پرویز مایوسؔ بڑی خوبیوں کے مالک ہیں۔۔۔۔۔۔ وہ افسانہ نگار ہیں، شاعر ہیں اور مترجم بھی، افسانے اردو میں بھی لکھتے ہیں اور پہاڑی میں بھی، شاعری بھی ان دونوں زبانوں میں کرتے ہیں۔'' (افسانوی مجموعہ ''مٹھی بھر چھاؤں''، صفحہ ۸)

بعد ازاں اپنے وطن سرینگر میں واپسی ہوئی اور سرینگر یونیورسٹی سے ایم۔ اے اردو کی ڈگری حاصل کرنے کے بعد درس وتدریس کے شعبے سے جڑ گئے اور بطور سرکاری ٹیچر وادی کے مختلف

اسکولوں میں تعلیمی خدمات دے رہے ہیں۔

پرویز مانوس نے اپنے ادبی سفر کا آغاز بطور شاعر ۱۹۸۸ء میں کیا اور شاعری میں دینا ناتھ رفیق سے اصلاح لینی شروع کی۔ شاعری کے ساتھ ساتھ آپ نے اردو فکشن کی مختلف اصناف میں طبع آزمائی شروع کی اور افسانے، افسانچے اور ناول لکھ کر فکشن کی دنیا میں بھی اپنی پہچان بنائی۔ ۱۹۸۸ء سے اب تک آپ نے اپنے ۳۵ سالہ ادبی سفر میں اردو ادب کی مختلف اصناف میں طبع آزمائی کی جس کے نتیجے میں آپ کی ۲۵ کتب شائع ہو چکی ہیں۔ پرویز مانوس کی علمی، ادبی اور دیگر خدمات کا اعتراف کرتے ہوئے آپ کو مختلف تعلیمی اور ادبی اداروں کی جانب سے مختلف ایوارڈز سے نوازا جا چکا ہے۔ پرویز مانوس نے ۱۹۸۹ء میں افسانے اور افسانچے لکھنے شروع کئے۔ جس کے نتیجے میں ان کا پہلا افسانوں اور افسانچوں کا مجموعہ ۱۹۹۵ء میں بعنوان ''شکارے کی موت'' منظر عام پر آیا۔ یہ افسانوی مجموعہ ۱۲، افسانوں اور ۹، افسانچوں پر مشتمل ہے۔ قابلِ ذکر ہے کہ ان کا دوسرا افسانوی مجموعے ''مٹھی بھر چھاؤں'' میں صرف افسانے ہی شامل کئے گئے ہیں۔ لیکن ان سے ایک ملاقات کے دوران کچھ غیر مطبوعہ افسانچے بھی دستیاب ہوئے ہیں۔ پرویز مانوسؔ افسانے اور افسانچے کے درمیان فرق سے بخوبی واقف ہیں۔ ساتھ ہی وہ لطیفے، اقوال زریں، حکایت اور افسانچے کے فرق کو بھی سمجھتے ہیں۔ مشہور و معروف فکشن نگار خالد حسین پرویز مانوس کی افسانہ نگاری اور افسانچہ نگاری کے بارے میں لکھتے ہیں:

''پرویز مانوسؔ کے ہاں یہ امر یہ اندازِ دگر کارفرما ہے۔ وہ مسائل بیان کرنے سے زیادہ اُن کے اظہار کے لیے بے تاب دکھائی دیتا ہے۔ اِس اظہار و ابلاغ کے لیے وہ افسانے کی دو تکنیکی اصناف کا سہارا لیتا ہے۔ مختصر افسانہ اور افسانچہ (منی کہانی)۔ فنی طور سے دونوں اصناف سے عہدہ برآ ہونے کے لئے جداگانہ (Treatment) کی ضرورت ہے۔ افسانچہ تیکھے، تیز کلائمکس اور موضوع براہ راست رسائی کا تقاضا کرتا ہے جبکہ مختصر افسانہ تخلیق کے مراحل سے بتدریج گزرتا ہے۔ پلاٹ کا انتخاب، کردار نگاری، زبان، مکالمے، ڈیولمپنٹ چابک دستی، فن کاری، منظر نگاری اور کلائمکس میں ایک خوشگوار توازن ہونا لازمی ہے جو کہ پرویز مایوسؔ کے یہاں پوری موجود ہے۔

پرویز مایوس نے دونوں اصناف پر طبع آزمائی کی ہے اور ایک ہونہار افسانہ نگار ہونے کے ثبوت بہم پہنچائے ہیں۔'' (افسانوی مجموعہ ''شکارے کی موت''، پرویز مایوسؔ، صفحہ ۵۔۶)

کسی بھی واقعہ یا کہانی کو مختصر طور پر پیش کرنے کا نام افسانچہ نگاری نہیں ہے۔ اختصار کے

ساتھ ساتھ افسانچے میں بھرپور کہانی کا مزہ برقرار رہنا ضروری ہے۔ پرویز مانوسؔ کے افسانچوں میں یہ عناصر نمائیاں طور پر نظر آتے ہیں۔ ایک اچھے افسانچے کی سب سے بڑی خوبی اُس کا کلائمکس ہوتا ہے۔ افسانچے کے ناقدین کے مطابق کلائمکس پر آکر افسانچہ بم کی طرح پھٹنا چاہئے۔ پرویز مانوسؔ کے افسانچوں میں ایک خوبی دیکھی جاسکتی ہے۔ اس ضمن میں ان کے دو افسانچے ''پولیس'' اور ''سزا'' قابل ذکر ہیں۔ ان دونوں افسانچوں میں افسانچہ نگار نے یہ دکھایا ہے کہ پولیس میں غلط لوگ بھرتی ہوگئے ہیں۔ جو ہمیشہ غلط کام کرتے ہیں۔ افسانچہ ''پولیس'' ملاحظہ فرمائیں:

پولیس

''ارے تم پولیس مین''

'الف' کو پولیس کی وردی میں دیکھ کر 'ب' چونک پڑا۔

''حیران کیوں ہوگئے۔۔۔۔'' الف نے ب سے پوچھا۔

''اس لئے کہ تم پہلے۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔''

''ہاں! ہاں! میں پہلے ایک غنڈہ تھا، تو کیا ہوا۔ ہم جیسے غنڈے، بدمعاش ہی تو پولیس کے قابل ہوتے ہیں۔'' (افسانوی مجموعہ ''شکارے کی موت''، صفحہ ۷۸)

اسی طرح افسانچہ ''سزا'' میں ایک جیب کتری عورت کو جب پولیس والے پکڑ کر لے جاتے ہیں تو اُسے سزا کے طور پر اپنی عزت گنوانی پڑتی ہے۔ اس افسانچے کا کلائمکس پیش خدمت ہے:

آنے دے بڑے صاحب کو، جیب کاٹنے کی ایسی سزا دیں گے تُو بھی کیا یاد کرے گی۔ لگتا ہے اس سے پہلے کبھی حوالات کی ہوا نہیں کھائی۔ اور پھر اس لڑکی کی پٹائی شروع کردی۔ سپاہی حوالدار سب ہی اپنے اپنے ہاتھ چلا رہے تھے۔ تھوڑی دیر میں وہ بے ہوش ہوگئی۔ جب اس کی آنکھ کھلی تو اس نے اپنے آپ کو ایک عالیشان خواب گاہ کے عالیشان بیڈ پر پایا۔ تھکاوٹ سے اس کا جسم چور چور تھا اور وہ اپنے کپڑے تلاش کررہی تھی۔ (افسانوی مجموعہ ''شکارے کی موت''، صفحہ ۴۹)

کہتے ہیں کہ برا کرنے والے کا کبھی بھلا نہیں ہوتا۔ آخر ایک دن دوسروں کا برا کرنے والا بہت پچھتاتا ہے۔ خدائی نظام ایک دن اُس کو اُس کے بُرے کاموں کی سزا دیتا ہے۔ پرویز مانوس نے اس موضوع پر ایک بہت عمدہ افسانچہ لکھا ہے۔ اس افسانچے میں ایک بُرا انسان اپنے کئے کی سزا پاتا ہے۔ افسانچہ ''احساس'' کا کلائمکس پیش خدمت ہے:

''اس کے کان بم دھماکے کی آواز سننے کے لئے بے چین تھے۔ دھماکہ کی آواز سن کر وہ اور خوش ہوا۔

دوسرے دن جب اس نے حسب معمول اخبار کا مطالعہ کیا تو۔۔۔۔ایک نام پر آ کر اس کی نظریں جم گئیں۔اخبار اس کے ہاتھ سے چھوٹ کر زمین پر گر پڑا۔ہاتھ پاؤں بری طرح کانپنے لگے۔ذرا سی دیر میں پسینے سے شرابور ہو گیا۔آج اس کو انسانی خون کی قیمت معلوم ہو گئی تھی۔اسے کسی کے مرنے کا پہلی بار احساس ہوا تھا یہ احساس اس لئے ہوا تھا کیونکہ جس ویڈیو ہال میں اس نے ٹائم بم رکھا تھا اس کے مرنے والوں میں اس کا سگا بھائی بھی شامل تھا۔(افسانوی مجموعہ ''شکارے کی موت''، ص ۵۰)

کرونا کی بوا کسی بڑی آفت سے کم نہیں تھی۔اُس دور میں ہر کوئی اپنی جان بچائے پھر رہا تھا۔اس بیماری کی وجہ سے انسان، انسان سے ڈرنے لگا تھا۔جب کسی پریوار کے ایک فرد کو کرونا ہو جاتا تھا۔تو گھر کے باقی کے افراد ڈر جاتے تھے۔اُس دور میں سنکڑوں لاشیں گنگا میں بھی بہتی نظر آئیں۔پرویز مانوسؔ نے اس موضوع پر بھی بہت ہی عمدہ افسانچہ لکھا ہے۔ان کا افسانچہ ''المیہ'' پیش خدمت ہے:

المیہ

رات کے گھنے اندھیرے میں وہ اوبڑ کھابڑ راستوں پر آگے بڑھ رہا تھا ایک تو ویسے بھی وہ بھاری بھرکم تھا دوسرا جسم پر گیلے ملبوسات کا وزن، اُس کے پاؤں من من بھاری ہو چکے تھے_یوں سمجھو وہ خود کو گھسیٹ رہا تھا آخر کار وہ اپنے گاؤں کی کچی سڑک پر پہنچ ہی گیا جو بالکل سُنسان تھی، سارے گاؤں میں اک ہُو کا عالم تھا، کبھی کبھار کسی کُتے کی آواز ماحول کو چیر کر نکل جاتی لیکن اُسے ذرا بھی خوف نہیں تھا کیونکہ وہ موت کو قریب سے دیکھ کر آیا تھا_ تھوڑی دیر سُستانے کے بعد اُس نے اپنے گھر کی جانب پھر قدم بڑھائے، مکان کو دیکھتے ہی اُس کی جان میں جان آئی اُس کے قدم تیز اُٹھنے لگے چند لمحوں بعد اُس نے گھر کے دروازے پر دستک دی تو اُس کے بیٹے نے پلنگ پر انگڑائی لی دستک کی آواز کانوں سے ٹکراتے ہی وہ اُٹھ کر بیٹھ گیا اور سوچنے لگا رات کے تین بجے کون ہو سکتا ہے، اُس نے بیوی کا جگایا اور دونوں سہمے سہمے دروازے کی جانب بڑھے کانپتے ہاتھوں سے اُس نے دروازے کی چٹخنی کھولی تو سامنے عجیب وغریب حُلیے میں اجنبی کو غور سے دیکھنے لگا، اچانک اُس کے مُنہ سے نکلا۔۔۔۔۔۔۔،، باپو وووو۔۔۔۔۔۔! کیوں مجھے یہاں دیکھ کر حیرانی ہوئی نا؟ ۔۔۔۔۔کیا یہی صلہ دیا تم نے تیس سال تک پالنے کا؟ تھوڑی دیر کے لئے میری سانس کیا رُکی تم نے مجھے اُٹھا کر گنگا میں پھینک دیا۔۔۔۔۔۔!'' (غیر مطبوعہ افسانچہ)

پرویز مانوس افسانچہ نگاری کے فن کو بخوبی سمجھنے لگے ہیں۔انھوں نے بہت کم افسانچے لکھے

ہیں لیکن جتنے بھی افسانچے لکھے ہیں بہت سوچ سمجھ کر لکھے ہیں۔ یہی ان کی افسانچہ نگاری کی کامیابی اور مقبولیت کا راز ہے۔ اس طرح ہم کہہ سکتے ہیں کہ ۱۹۹۵ء میں شائع ہوئے افسانوی مجموعے ''شکارے کی موت'' کے افسانچوں کے مقابلے میں پرویز مانوسؔ کے موجودہ دور کے افسانوں میں بہت زیادہ پختگی آ گئی ہے۔ان کے ہاں موضوعات کا دائرہ بہت وسیع ہوگیا ہے۔ساتھ ہی ان کے افسانچوں کے کلائمکس بے حد چونکا دینے والے ہیں۔اس طرح موصوف ایک ذہین اور باکمال افسانچہ نگار کے طور پر ابھر کر سامنے آئے ہیں۔

ان چند افسانچوں کے مطالعے کے بعد ہم کہہ سکتے ہیں کہ پرویز مانوس زندگی کی گود سے تلخ حقائق چُرانے میں ماہر ہیں۔ساتھ ہی وہ کسی واقعے کو افسانچے کے ڈھانچے میں ڈھالنے کے ہنر میں بھی مہارت رکھتے ہیں۔ان کے افسانچوں کا ایک ایک جملہ قاری کے تجسس میں اضافہ کرتا جاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے افسانچوں کا کلائمکس قاری کو حیران کر دیتا ہے اور وہ عش عش کر اٹھتا ہے۔المختصر یہ کہ پرویز مانوس جموں وکشمیر کے ایک منفرد افسانچہ نگار ہیں۔ضرورت ہے کہ وہ اس صنف کی طرف سنجیدگی سے دھیان دیں تا کہ مستقبل میں ان کی قلم سے کچھ اور بہترین افسانچے قارئین کو پڑھنے کو ملیں۔

☆☆☆

غزلیں Ghazlein

خالد جمال (وارانسی)
Khalid Jamal (Varanasi)
cell-9838202248

ضرب فرہاد لگا سکتے ہو
تم تو دریا بھی بہا سکتے ہو
اب طبیعت میں گرانی کم ہے
تم مجھے چھوڑ کے جا سکتے ہو
گھر کا دروازہ کھلا ہے اب بھی
تم اگر چاہو تو آ سکتے ہو
کوئی درماں نہیں لیکن مجھ سے
درد تم اپنا بتا سکتے ہو
وقت کی نبض پہ انگلی رکھ کر
راز سر بستہ بتا سکتے ہو
میں قریب اور بھی آ سکتا ہوں
تم اگر پردا ہٹا سکتے ہو
حوصلہ ہار دیا ہے اس نے
اب جو چاہو تو ہرا سکتے ہو
اس ہنر میں بھی ہو یکتا، تنہا
روٹھ جاؤں تو منا سکتے ہو
ہاں یہ مشکل ہے پہ دشوار نہیں
راستہ اپنا بنا سکتے ہو

☆☆☆

(2)

مرے افکار بے در بھول جاؤ
بھلایا سب نے اکثر بھول جاؤ

رویہ جو بھی تھا اچھا نہیں تھا
برا سپنا سمجھ کر بھول جاؤ

اندھیرے جانے کب سے منتظر ہیں
چراغوں کو جلاکر بھول جاؤ

یہاں تو بیش وکم ہوتا رہا ہے
اٹھاؤ اپنا ساغر بھول جاؤ

ستاتی ہیں مری یادیں تو ان کو
کسی کونے میں رکھ کر بھول جاؤ

چلو مانا کہ میں اک اجنبی ہوں
تو ڈالو خاک بے زر بھول جاؤ

☆☆☆

خورشید بسمل (تھنہ منڈی، راجوری)
Khurshid Bismil (Rajouri)
cell-9622045323

جھوٹ نکلے خواب سارے ساری تعبیریں غلط
سارے اندازے غلط تھے ساری تفسیریں غلط
مجھ کو وہ الفاظ کے شیشوں میں کیسے ڈھالتا
اس کی تدبیریں غلط تھیں اس کی تقریریں غلط
خاک جب ہم ہو گئے تو راز یہ افشاں ہوا
اس کے وعدے جھوٹ تھے سب اس کی تحریریں غلط
چاند سورج میرے کوچے میں کبھی آئے نہیں
غالباً اس شہر کی ہیں ساری تعمیریں غلط
رنگ اور خاکوں کے رشتے ٹوٹ جائیں گے سبھی
اور پھر ہو جائیں گی بسملؔ یہ تصویریں غلط

☆☆☆

دوستو! کیسے کہوں کیسی قیامت ہوگئی
زندگی جو بھی ملی وقف ملامت ہو گئی
ٹہنی ٹہنی پھول خوشیوں کے تلاشے تھے مگر
ہر قدم پر خار پائے اور ندامت ہو گئی
توڑ ڈالے سب عزائم خامشی میں گم ہوئے
ختم میرے شہر والوں کی شکایت ہو گئی
رات بھر خوابوں نے بسملؔ درد سہلائے بہت
صبح کی پہلی کرن سے پھر عداوت ہو گئی

☆☆☆

ڈاکٹر بختیار نواز (وارانسی) cell-9336900864
Dr. Bakhteyar Nawaz(VNS)

پتھر کا شہر ہے مرا پتھر کا آدمی
کیسے ملے گا موم سے پتھر کا آدمی
ویسے تو سارے شہر میں مشہور ہوں مگر
واقف نہیں ہے مجھ سے برابر کا آدمی
جب میں نے جبر و ظلم سے سمجھوتا کر لیا
ناراض ہو گیا مرے اندر کا آدمی
ڈرتا ہوں پانیوں کے سفر پہ یہ سوچ کر
"کھا جائے گا مجھے بھی سمندر کا آدمی"
جو شخص ایک در پہ جھکاتا نہیں ہے سر
آخر کو وہ ہی ہوتا ہے در در کا آدمی
تعبیر اس کی کوئی بتائے مجھے نوازؔ
دیکھا ہے میں نے خواب میں بے سر کا آدمی

☆☆☆

ادھورے زیست کے خاکوں میں رنگ بھرنے دے
پھر اس کے بعد مجھے جان سے گزرنے دے
خود اپنا راستہ روکے کھڑا ہوا کوئی شخص
ہر اک سے کہتا ہے پہلے مجھے گزرنے دے
مجھے گریز نہیں اور تیر کھانے سے
مگر جو زخم ہیں تازہ انہیں تو بھرنے دے
اگر نکل نہ سکے کوئی صورت تکمیل
تو خواہشوں کو مری خامشی سے مرنے دے
میں زندگی میں بھی آنکھیں ملاؤں گا اے نوازؔ
فراز دار سے پہلے مجھے اترنے دے

ڈاکٹر راکیش کمار طالب (سرینگر)
Dr. Rakesh Kumar Talib
Srinagar cell-9682562091

اس کی جو راہ ہے دشوار ہوئی جاتی ہے
زندگی سب پہ گراں بار ہوئی جاتی ہے
وقت کے ساتھ بدل دیتی ہے یہ اپنی روش
ساری دنیا ہی اداکار ہوئی جاتی ہے
جان لیتی ہے کہ لوگوں کے ہیں انداز الگ
زندگی خود بھی تو فن کار ہوئی جاتی ہے
وقت کچھ ایسا پڑا ہے کہ بیاں کیسے کروں
زندگی مستقل آزار ہوئی جاتی ہے
مشکلیں جب سے پڑی ہیں مرے نازک دل پر
زندگی آہنی دیوار ہوئی جاتی ہے
آپ نکلے ہیں جفاکار فقط اتنا کہا
کتنی برہم مری سرکار ہوئی جاتی ہے
مسکراتے ہوئے طالبؔ وہ گزرتا ہے اگر
دل سے ہر ایک نظر پار ہوئی جاتی ہے

☆☆☆

(2)

کس قدر دل شکن یہ منظر ہے
ہر طرف خون سے زمیں تر ہے
جانتا ہوں وہ دل کا پتھر ہے
دور رہنا ہی اس سے بہتر ہے
کتنا گہرا ہے ہم میں یہ رشتہ
میں اگر لفظ ہوں وہ مصدر ہے
آپ کرتے رہیں خطائیں مگر
جو بھی الزام ہے مرے سر ہے
میں بھی اک جھونپڑے میں رہتا ہوں
میرا بھی اک شکستہ سا گھر ہے
ہم ہی اہل نظر نہیں ورنہ
جو بھی کانٹا ہے وہ گل تر ہے
ایسے دشمن ہوئی ہے یہ دنیا
میرا سر اور آپ کا در ہے
جو بھی ہووے ستم سہے ہنس کر
دل کہ جورو جفا کا خوگر ہے
میں ہوں عزم و عمل سے دور اگر
کیسے کہ دوں مرا مقدر ہے
وقت ملتا نہیں کہ دیکھ سکوں
ایک دنیا جو میرے اندر ہے
دور ہے اب فریب کاری سے
جو خلوص و وفا کا پیکر ہے
یہ بھی اس کا کرم ہے اے طالبؔ
جو مصیبت ہے وہ مرے سر ہے☆☆☆

نظم Nazm

گل جہاں (ڈیرہ اسماعیل خاں)
Gul jahan(Dera Ismail Khan)

چار بیٹے Chaar Bete

آج عجب دو دھاروں پر
دل کی دھڑکن چل نکلی
ایک پرانی سائکل والا
پھولوں کو کچھ ہار اور گجرے
اور انہیں پھولوں کی پتیاں
لے کے بیچ چورا ہے، اپنے
اکلوتے معذور بیٹے کا
رزق کمانے نکلا تھا!
دیر تلک وہ یونہی فارغ
پھولوں گجروں اور پتیوں کو
سجا سجا کر رکھتا رہا تھا
تھکتا رہا تھا!
گاہک نہ تھا
اور اچانک ایک ہی وقت میں
دو سمتوں سے گاہک آئے
ایک جوان، نمی آنکھوں میں
کانپتے بھیگے سے لہجے میں
اس سے بولا
بھائی پتیاں کیسے دی ہیں؟
عین اسی وقت
بوڑھا گاہک پیار سے گجرے ہاتھ میں لے کر
پوچھنے لگا یہ
بھائی درجن گجرے دے دو
اور بتاؤ ہار ہیں کتنے؟
میرے بیٹے کی شادی ہے
ایسا کرو! یہ سارے دے دو
گجرے والا خوش اور حیراں
دونوں کو ٹک ٹک دیکھے تھا!
جواں چھلکتی آنکھوں کو یکدم رگڑ کر
منت بھرے لہجے میں بولا
بھائی تھوڑا جلدی کر دو
ابو جی کی قبر پہ مجھ کو
فاتحہ پڑھنے جانا ہے!
ان کا مکالمہ سنتے ہوئے میں سوچ رہی تھی
اچھا مالک! تیری مرضی
حمل نہ ضائع ہوتا تو پھر
چند ہی ماہ میں
میری گود میں بیٹا ہوتا!

☆☆☆

Afsaane

Rani ke Heera Moti by Najma Usman (Surrey, U.K)
نجمہ عثمان (سرے، یو۔کے۔) cell-0044-793-691-1711

رانی کے ہیرا موتی

گلابوں کی کیاری میں سرخ ، گلابی پیلے اور زرد رنگوں کی بہار تھی۔مئی کے مہینے سے ہی۔گلابوں کے پودے ننھی ننھی کلیوں سے ڈھک گئے تھے۔ادھر کئی دن تک سورج کی کرنیں ہوا کے ہلکے ہلکے جھونکوں کے ساتھ سارے باغ میں تمازت پھیلاتی رہیں اور ایک شب ساری کلیاں جیسے ایک ساتھ ہی گھنگھنا کر کھکھلا اٹھیں۔سورج کی پہلی کرن نے ان رنگ برنگے ہنستے مسکراتے پھولوں کو بڑی حیرانی سے دیکھا اور بادلوں کے ایک ننھے سے ٹکڑے سے ان پر سایہ کر دیا جیسے نظر بد سے بچانا چاہتا ہو۔نرگس ناشتے کے بعد چڑیوں کے لیے بچی ہوئی ڈبل روٹی کے ٹکڑے لئے ہوئے باہر نکلی تو ٹھٹھک کر رہ گئی۔سرسبز لان کے آخری سرے پر گلابوں کے قطعے میں جیسے رنگوں کا ایک سیلاب سا امنڈ آیا تھا۔اسی وقت اس نے رانی کو اس طرف جاتے ہوئے دیکھا۔

'ٹھہر تو جا رانی کی بچی! میں تیری خبر لیتی ہوں۔خبردار جو میرے گلابوں میں گھسی'۔ یہ کہتی ہوئی وہ اس کے پیچھے لپکی۔رانی اس کی آواز سنتے ہی گلابوں کے پیچھے کھڑے ہوئے کونیفرز کے درختوں میں جا چھپی تھی۔ یاسمین اسے بھول بھال کر رنگوں کے طلسم میں کھو گئی۔سبحان تیری قدرت! وہ بڑے پیار سے گہرے سرخ رنگ کے گلاب پر ہاتھ پھیرنے لگی۔

دائیں طرف والے گارڈن کی فینس سے بھورے بالوں کا ایک سرا بھرا۔

مارننگ نرگس آنٹی! آپ نے رانی کو کہیں دیکھا ہے؟

'وعلیکم مارننگ۔میرا مطلب ہے وعلیکم سلام! دیکھا بھی ہے اور ڈانٹا بھی۔اب ڈر کر پیچھے والے درخت میں جا

چھپی ہے۔آ کر باہر نکالو'۔نرگس کا لہجہ خاصا بے زار تھا۔

'سوسوری آنٹی!' یاسمین یہ کہتے ہوئے جلدی سے فینس کے ساتھ لگے ہوئے دروازے سے داخل

ہوئی اور 'رانی۔ رانی' پکارتی ہوئی گلاب کی کیاری کی طرف لپکی۔ اس کی آواز سن کر رانی درخت کے پیچھے سے یوں باہر نکلی جیسے اس کا انتظار ہی کر رہی ہو گول گول بھوری آنکھوں میں سارے جہان کی معصومیت بھر گئی تھی۔ یاسمین نے اسے گود میں اٹھالیا، 'ویری ناٹی رانی! آنٹی کو سوری کہو'۔ رانی نے اس کی گود میں یوں منہ چھپالیا جیسے کہہ رہی ہو۔ میں نے کیا کیا ہے؟

اس کے چھپنے کی عادت سے نرگس بخوبی واقف تھی۔ یاسمین اور نعیم ان کے نئے پڑوسی تھے پچھلے ہفتے ہی برابر والے مکان میں شفٹ ہوئے تھے۔ دونوں خود ہی آ کر اپنا تعارف بھی کرا گئے۔ نرگس اور جمال کو بڑے اپنے سے لگے اپنے بیٹا بیٹی تو نوکریوں کی وجہ سے لندن سے دور رہنے پر مجبور تھے اور سال میں دو تین مرتبہ ہی ملاقات ہو پاتی تھی۔ نرگس بڑی خوش تھی چلو پڑوس تو آباد ہوا ورنہ پچھلے سال بھر سے خالی پڑا تھا۔ اسی شام وہ سینڈوچ کی ایک پلیٹ بنا کر ان کے دروازے پر پہنچ گئی۔ بیل بجانے پر یاسمین نے دروازہ کھولا۔

'آپ نے تو بڑا تکلف کیا۔ تھینک یو سو مچ'۔ آیئے اندر'۔ وہ نرگس کو سامنے والے کمرے میں لے آئی۔

'ایکس کیوز دامیس' اس نے چاروں طرف پھیلے ہوئے گتے کے ڈبوں کے بیچ میں جگہ بناتے ہوئے اسے بڑی سی ڈائننگ ٹیبل کے ساتھ لگی ہوئی ایک کرسی پر بٹھاتے ہوئے کہا۔

'گھر شفٹ کرنا آسان نہیں'۔ سامان بھی سیٹ ہو جائے گا، نرگس ادھر ادھر دیکھ رہی تھی۔ اوپر سے نعیم تقریباً بھاگتا ہوا نیچے آیا۔ بال اور کپڑے گرد آلود ہو رہے تھے۔

یاسمین نے بتایا دیکھو آنٹی کیا لائی ہیں! پھر رکتے ہوئے بولی ہم آپ کو آنٹی کہہ سکتے ہیں نا!

'بالکل بھئی! تم دونوں تو میرے بیٹے فرز اور بیٹی شہلا جیسے ہو'۔ وہ اب بھی ادھر ادھر دیکھ رہی تھی۔ 'اور تمہارے

ساتھ کون ہے؟'

اسے بال بچوں کے بارے میں سیدھے سوال کرنا مناسب نہیں لگا۔ اسی وقت میز کے نیچے سے کچھ کھڑ پٹر سنائی دی۔

'یہ لیجیے'۔۔ نعیم ہنستے ہوئے بولا' آپ نے پوچھا اور کون ہے اور رانی بیٹا شرما کر میز کے نیچے چھپ گئیں'۔

'اے ہے۔ ننھی سی جان کو کہاں گھسنے دیا۔ کہیں چوٹ نہ لگ جائے۔ نرگس میز کے نیچے جھانکنے کی

ناکام کوشش کر رہی تھی۔

'ارے نہیں آنٹی۔ اسے تو ہر کونے کدھرے میں گھسنے کا شوق ہے۔ ویسے بھی شی از ویری شائی'۔

کم آن رانی! باہر آؤ۔ میز کے نیچے سے آوازیں اب بھی آ رہی تھیں۔

نرگس نے دل میں سوچا عجیب لاپرواہ سے ماں باپ ہیں۔ اور یہ کون سا ماڈرن طریقہ ہے بچوں کو پالنے کا۔ وہ اچانک ہی نیچے سے نکل کر نعیم کی گود میں جا بیٹھی۔

یہ ہے ہماری بے بی رانی۔ یاسمین اس کے بھورے بالوں پر پیار سے ہاتھ پھیرنے لگی۔

'یہ۔۔ یہ رانی؟' نرگس مجسم سوال بن گئی 'اور میں سمجھی تھی کہ رانی بٹیا۔۔۔' اس نے جملہ ادھورا چھوڑ دیا۔

یاسمین اور نعیم نے ایک ساتھ قہقہہ لگایا۔ 'سوری آنٹی آپ غلط سمجھیں رانی تو ہماری پیاری سی بلی کا نام ہے اور اس کے نخرے دس بچوں کے برابر ہیں۔'

نرگس اپنی حماقت پر شرمندہ سی تھی۔

تم لوگ اپنا کام کرو میں پھر آؤں گی۔ کوئی چیز چاہیے ہو تو بتانا۔

گھر آ کر اس نے جمال کو یہ قصہ سنایا۔ وہ بھی ہنسنے لگا پھر اسے سیریس دیکھ کر جلدی سے بولا۔ مجھے تو خود بلیاں پالنے کا بہت شوق تھا پھر تم سے شادی کے بعد اس کی خواہش ہی نہیں رہی۔

کیا مطلب ہے۔ میری عادتیں کیا بلی جیسی ہیں؟

'نہیں بھئی تمہارے اتنے خوبصورت گارڈن میں انسانوں کو تو سنبھل کے رہنا پڑتا ہے پھر جانوروں کی تو بالکل بھی گنجائش نہیں۔'

نرگس کو اپنے پوتے اور نواسیوں کا خیال آیا۔ ان کا گارڈن میں بال کھیلنا منع تھا۔ ہمیشہ ان کے آتے ہی جمال سب کو لے کر مقامی پارک میں چلا جاتا۔ نرگس نے اپنے بچے بھی ایسے ہی پالے۔ جب گیند بلا اور فٹ بال ہاتھ میں آیا تو وہ پارک میں جا کر کھیلتے تھے۔

اور رانی کے کیا ٹھاٹھ تھے۔ پورے گھر میں بھاگتی دوڑتی پھرتی۔ سوائے باتھ رومز کے۔ ان کے دروازے ہمیشہ بند رکھے جاتے تھے۔ اس کے سونے کے کے لیے گلابی رنگ کا کریڈل جس میں نرم گدا بچھا ہوا اور ہڈی کی شکل کا منا سا گلابی تکیہ۔ پچھلے باغ کی طرف کھلنے والے شیشے کے دروازے کے ساتھ رکھا ہوا لکڑی کا تخت جس پر چھوٹا سا قالین اور ایک گاؤ تکیہ بھی لگا ہوا۔ اس پر بیٹھ کر وہ گھنٹوں باہر اڑنے والے پرندوں، تتلیوں اور ہوا سے ہلتے ہوئے پودوں اور درختوں کو دیکھا کرتی۔ یاسمین کا

کہنا تھا کہ جب تک وہ چھ مہینے کی نہیں ہو جاتی اس کو باہر گھومنے پھرنے کے لیے نہیں چھوڑا جا سکتا۔ پھر اس سے پہلے اس کے گلے میں مائکرو چپ ڈالنا بھی ضروری تھا تا کہ کچن میں بنے ہوئے کیٹ فلیپ سے صرف وہی اندر باہر آ جا سکے۔

ان چند ہفتوں میں نرگس کو بلیوں کے بارے میں اتنی معلومات حاصل ہو گئی تھیں جو سالوں میں بھی نہیں مل سکتیں۔ یاسمین اور نعیم جب بھی ملتے گھوم پھر کے رانی کا ہی ذکر ہوتا۔ حالانکہ دونوں فل ٹائم جاب پر ہوتے۔ یاسمین تو چار بجے گھر آ جاتی لیکن نعیم بہت دیر سے آتا۔ ایک سوفٹ ویر ڈیزائنر کمپنی کا انچارج ہونے کی وجہ سے اسے کبھی کبھی لندن سے باہر بھی جانا پڑتا۔ بلیوں کے علاوہ نرگس کو یاسمین اور نعیم کی نجی زندگی کے بارے میں کچھ زیادہ معلوم نہیں ہو پایا تھا۔ شادی کو دو سال ہوئے تھے اور یاسمین اور نعیم کی آپس میں رشتہ داری بھی تھی۔ نعیم تو کئی برس سے لندن میں تھا اور جاب بھی کر رہا تھا۔ والدین نے پاکستان بلا کر اس کی شادی طے کی۔ گھر کی دیکھی بھالی لڑکی تھی ڈگری یافتہ۔ اسکول میں پڑھا رہی تھی۔ یوں یاسمین لندن آ گئی اور ٹیچنگ بھی شروع کر دی۔

یاسمین کو بلیاں بہت پسند تھیں لیکن نعیم کے لیے یہ بڑی ذمہ داری تھی۔ کس طرح یاسمین نے نعیم کو راضی کیا یہ ایک الگ کہانی تھی۔

کہاں تو نعیم گھر میں پالتو بلی رکھنے کے حق میں نہیں تھا اور کہاں اب یہ حال تھا کہ اسے دیکھے بغیر اس کا دن ہی شروع نہیں ہوتا۔ یاسمین نے ایک دن باتوں ہی باتوں میں نرگس کو بتایا 'آنٹی! رانی نے تو ہم دونوں کی دنیا ہی بدل کر رکھ دی ہے۔ اگر کبھی نعیم کو غصہ آ جائے تو اس پیاری سی ننھی سی بے زبان بلی کے آگے ان کا سارا طنطنہ، اور غصہ صابن کے جھاگ کی طرح بیٹھ جاتا ہے۔ صبح اس سے کھیلے بغیر آفس نہیں جاتے۔ رات کو اسے اپنے سینے پر سلاتے ہیں۔'

مئی کی اس شام کو موسم بہت خوشگوار ہو گیا تھا۔ نرگس گارڈن میں پانی دے رہی تھی۔ فینس کے پیچھے سے یاسمین نے آواز لگائی، 'آنٹی آ جائیں میں نے گرم گرم پکوڑے تلے ہیں۔ انکل کہاں ہیں؟'

وہ تو ایک دوست کے ساتھ کوئی آرٹ کی نمائش دیکھنے گئے ہیں۔ میں آتی ہوں'۔

دونوں چائے کے ساتھ پکوڑوں کا لطف اٹھا رہی تھیں۔ رانی حسب معمول اپنے تخت پر بیٹھی شیشے کے آر پار نظارے سے لطف اندوز ہو رہی تھی۔ نعیم اچانک ہی گھر آ گیا۔ یاسمین گھبرا گئی۔ 'خیریت تو ہے'؟

نعیم بہت جوش میں تھا بس جلدی سے اندر آؤ۔ دیکھو میں کیا لایا ہوں؟ آنٹی پلیز کم ان'

رانی کود کر نعیم کے کندھے پر چڑھ گئی تھی۔ رانی نیچے اترو۔ وہ بڑے سے ڈبے کی پیکنگ بے صبری سے کھولنے لگا گول پلیٹ فارم کی شکل میں بنا ہوا جوٹ سے گندھا ایک دومنزلہ پلیٹ فارم جس کے ستون سے اون کی بنی ہوئی کئی گیندیں لٹکی ہوئی تھیں۔

رانی نعیم کے کندھے سے چھلانگ لگا کر اوپر والے پلیٹ فارم پر جا بیٹھی اور اپنے پنجے سے ادھر ادھر لٹکی ہوئی گیندوں سے کھیلنے لگی۔ یہ کس قسم کا کھلونا ہے؟ نرگس پوچھ بیٹھی۔

یہ رانی کا ایکٹی وٹی سینٹر ہے۔ اوپر نیچے کودے پھاندے گی اور یہ جوٹ کا جو ستون سا ہے اس پر اپنے پنجے رگڑے گی ورنہ سارے فرنیچر پر پنجہ آزمائی کرتی ہے۔ اور یاسمین کو پریشانی ہوتی ہے۔ صوفوں پر کہاں تک موٹی موٹی چادریں ڈالے۔

اس ہفتے دو بار رانی گھر سے باہر نکل بھاگی۔ اور دونوں مرتبہ نرگس کی گلاب کی کیاری میں سفید گلاب کے نیچے مٹی کھودتی ہوئی پائی گئی۔

یاسمین اور نعیم دونوں بہت پریشان تھے۔ اب یہ چھ مہینے کی ہوگئی ہے۔ جب تک اس کے گلے میں مائکرو چپ نہیں پڑ جاتا اسوقت تک کیٹ فلیپ نہیں کھل سکتا اور پھر اس کا آپریشن بھی ضروری ہے۔ مائی پوور بے بی۔ نعیم نے کسی فکرمند باپ کی طرح رانی کو گلے سے لگالیا۔

نرگس اپنے پھولوں کی کیاری کی بربادی کی شکایت کو اگلے وقت کے لئے اٹھاتے ہوئے پوچھا۔

'کیسا آپریشن؟

نعیم نے جز بز ہوتے ہوئے یاسمین کی طرف دیکھا۔

'اس سے پہلے کہ رانی باہر نکلنے لگے ہمیں اس کی حفاظت کے لئے آپریشن کروانا ہوگا۔ ورنہ تو پھر بچوں کا مسئلہ ہوجائے گا'

نرگس کو ہنسی آ گئی۔ بھئی بلیاں پالوگی تو بچے بھی ہوں گے۔ تم لوگ تو ایسے پریشان ہورہے ہو جیسے کنواری لڑکی کے والدین فکرمند ہوتے ہیں'۔

نعیم رانی کو گود میں اٹھائے بغیر جواب دیے کمرے سے باہر نکل گیا۔

'سچ آنٹی۔ یہ سیریس مسئلہ ہے۔ ہم نہیں چاہتے ہماری رانی اس تکلیف سے گزرے۔ چھوٹا سا آپریشن ہے پھر یہ آزادی سے رات بھر باہر رہ سکتی ہے۔ مجھے تو بڑی فکر ہے۔ جلد ہی ویٹ (جانوروں کے ڈاکٹر) کے پاس جانا ہوگا'۔

رانی کو صبح نو بجے لے جانا تھا۔ رات بارہ بجے سے اس کا کھانا پینا بند کرنا پڑا۔ نعیم اور یاسمین سے بھی

صبح کچھ نہیں کھایا گیا۔ دونوں اسے ایک گتے کے ڈبے میں بٹھا کر لے گئے۔ نعیم گاڑی چلا رہا تھا اور پچھلی سیٹ پر یاسمین ڈبے کو سنبھال کر بیٹھ گئی۔

ان کے جانے کے بعد نرگس انجانے طور پر ان کی واپسی کا انتظار کرنے لگی۔ جمال کے ساتھ واک پر جانا تھا لیکن وہ ٹال گئی۔ ہر پندرہ منٹ کے بعد سامنے والے کمرے کی کھڑکی سے باہر جھانک لیتی۔ پچھلے دنوں اس کی بیٹی کی ہاتھ کی کلائی کا چھوٹا سا آپریشن ہوا تھا۔ سارا وقت وہ ہسپتال میں بیٹھی اس کی سلامتی کی دعائیں مانگتی رہی۔ بعد میں بھی دیکھ بھال کے لئے دو دن بیٹی کے گھر رہی۔ یہ میں کیا سوچنے لگی؟ کہاں شہلا اور کہاں رانی۔ لیکن آپریشن تو ہے۔ جانور کو بھی تکلیف ہوتی ہے۔ اور اس بے زبان سے تو ماں بننے کا حق چھینا جا رہا ہے۔

بیشک اس کی بھلائی کے لیے۔۔ بلکہ دیکھا جائے تو پالنے والوں کی اپنی سہولت کے لیے۔ وہ اپنے الجھے ہوئے خیالات سے الجھتی ہوئی پھر کھڑکی میں جا کھڑی ہوئی۔ نعیم کی کار پورچ میں کھڑی تھی۔ اس نے سوچا وہ آفس چلا جائے تو رانی کی خیریت پوچھونگی۔ کیونکہ یاسمین نے تو پورے دن کی چھٹی لی تھی۔ نعیم سارا دن گھر پر رہا۔

پتہ نہیں رانی کس حال میں تھی۔ شام کو نرگس اور جمال اس کی خیریت پوچھنے گئے۔ دروازہ نعیم نے کھولا تھا۔ بڑا پریشان پریشان سا لگ رہا تھا۔ یاسمین رانی کو گود میں لیے بیٹھی تھی۔

کیوں بھئی سب خیریت ہے؟ نرگس نے بیقراری سے پوچھا۔ نعیم اور یاسمین کبھی ایک دوسرے کو دیکھتے کبھی رانی کی طرف تاسف سے تکتے۔

جمال نے نعیم کی پشت پر ہاتھ رکھ کر بڑی اپنائیت سے پوچھا؟ آپریشن کامیاب تو ہو گیا؟

نعیم رونے کے قریب تھا۔ 'انکل! سب گڑبڑ ہو گئی ہم چاہتے ہوئے بھی رانی کو نہ بچا سکے۔

نرگس نے دہل کر یاسمین کی گود میں دبکی ہوئی رانی کو دیکھا۔ جو بظاہر کسی تکلیف میں نہیں تھی بلکہ آرام سے سو رہی تھی۔

'خدانہ کرے کیا بیماری ہو گئی ہے۔؟ کل تک تو بالکل ٹھیک تھی۔'

یاسمین نے رانی پر ہاتھ پھیرتے ہوئے رقت بھری آواز میں کہا۔ 'ہماری رانی پریگننیٹ ہو گئی ہے'۔

نرگس اور جمال کا منہ حیرت و استعجاب سے کھلا ہوا تھا۔

' تو پھر آپریشن؟'

'اب نہیں ہوسکتا دو ہفتے سے زیادہ ہو چکے ہیں۔ مائی پوور پوور بے بی۔ یہ تم نے کیا کیا؟' نعیم رانی سے مخاطب تھا، پھر یاسمین سے بولا 'تم نے اسے باہر کیوں جانے دیا؟'

'میں کیا کرتی۔ چوبیس گھنٹے تو گارڈ نہیں کرسکتی۔ اور یہ تو سیدھی آنٹی کے گارڈن میں گھستی ہے۔ میں کتنی دفعہ پکڑ کر لائی ہوں'۔

نرگس نے اس بحث کو ختم کرنے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔ 'جو ہوا سو ہوا۔ اب آگے کا سوچو۔ یہ بچے کب پیدا ہوں گے؟ اور ان کا کیا کرو گے'۔ وہ تصور میں چھ سات بلی کے بچوں کو اپنے گارڈن میں گندگی پھیلاتے دیکھ رہی تھی۔

'وی ڈونٹ نو' نعیم بے بسی سے بولا۔ 'ابھی تو رانی کی دیکھ بھال ضروری ہے۔ اس کی ڈائٹ اور دوسری چیزوں کا خیال کرنا ہوگا۔ کیٹ فلیپ اب بند کرنے کا کوئی فائدہ نہیں۔ اب تو یہ رات کو زیادہ تر باہر ہی رہے گی'۔

یہ کہہ کر وہ پھر یاسمین کی گود میں سوئی ہوئی رانی پر جھک گیا۔ ایک فکرمند باپ کی طرح جس کی بیٹی نے گھر سے بھاگ کر اپنی پسند کی شادی کر لی ہو۔

بلیاں عموماً چھ ہفتے بعد بچے دیتی ہیں۔ رانی کے دو ہفتے تو ہو چلے تھے۔ اس کا وزن بھی بڑھ رہا تھا اور چال بھی بدلتی جا رہی تھی۔ نرگس اب گارڈن میں گھنٹوں بیٹھی اس کی حرکات وسکنات کو غور سے دیکھتی رہتی۔ اب وہ دوڑنے کے بجائے سنبھل سنبھل کر چلتی۔ اور چڑیوں کے پیچھے تو اس نے بھاگنا بالکل ہی چھوڑ دیا تھا۔ نرگس کی غیر موجودگی میں وہ سفید گلاب کے نیچے پڑی دھوپ تاپتی رہتی یا پھر پھیل کر آرام سے سو جاتی۔ اس کی آہٹ پا کر وہ وہاں سے بھاگنے کی فکر میں چوکنی ہو کر بیٹھ جاتی اور جیسے ہی وہ قریب آتی رانی جائے فرار اختیار کرتی۔ اب نرگس کو اس پر ترس آنے لگا تھا۔

اے نگوڑی سے بھاگا بھی تو نہیں جاتا۔ بس اس سفید گلاب کا ستیاناس ہو گیا۔ اب اس میں پھول تو آنے سے رہے ساری جڑیں کھود کے پھینک دی ہیں۔ اس سے پہلے اس نے کئی دفعہ گلاب کے چاروں طرف اینٹی کیٹ

سپرے چھڑک کے دیکھا اور گھریلو ٹوٹکے کے طور پر مالٹے کے چھلکے پورے گلاب کی کیاری میں بکھیر دیے۔ لیکن رانی پر ان چیزوں کا کوئی اثر نہیں ہوا۔ اب تو نرگس نے بھی رانی کو کھلی آزادی دے دی تھی۔

جون کا مہینہ شروع ہو چکا تھا۔ یعنی امتحانوں کا سیزن۔ سب پڑھائی میں مصروف تھے ان کے

دونوں پوتے اور نواسی اے لیول کے امتحان دے رہے تھے۔ پچھلے تین ہفتے سے کوئی آنا جانا نہیں ہوا تھا۔ گھر میں عجیب سا سناٹا تھا۔ پہلی دفعہ نرگس کو احساس ہوا بچوں کے بچے بڑے ہو جائیں تو ان کی اپنی مصروفیات ہو جاتی ہیں۔ ہفتے کی شام کو فراز سے فون پر بات ہوئی۔ شہلا کا بھی فون آیا دونوں ہی رانی کی خیریت دریافت کر رہے تھے۔ اب ان کے جاننے والوں میں سے ہر شخص ان کا حال پوچھنے کے بجائے رانی کے بارے میں پوچھتا۔

اتوار کی صبح بیل کی تیز آواز سن کر نرگس بیڈ سے اتر کر نیچے بھاگی۔ ابھی تو نو بھی نہیں بجے تھے۔ یہ اتوار کی صبح کون آ گیا؟ پہلا دھیان اپنے بچوں کی طرف گیا۔ خدا کرے سب خیریت ہو۔ دروازے پر یاسمین اور نعیم کھڑے تھے۔ یاسمین کی آنکھیں جل تھل ہو رہی تھیں اور نعیم کا چہرہ سرخ ہو رہا تھا۔

اندر آ جاؤ بچو! نرگس ان کی حالت دیکھ کر گھبرا گئی۔ کیا ہوا؟

یاسمین اس کے گلے سے لگ کر ہچکیوں سے رونے لگی اور نعیم نے ایک کرسی پر بیٹھ کر اپنے بازوؤں سے چہرہ چھپا لیا۔

جمال بھی گاؤن لپیٹ کر نیچے آ گیا تھا۔

'ارے بچو! خدا کے لیے بتاؤ تو کیا ہوا؟ پاکستان میں سب خیریت ہے؟'

یاسمین کی ہچکیاں تیز ہو گئیں۔ نعیم نے اپنا بازوؤں میں سے سر نکال کر ٹوٹی ہوئی آواز میں کہا۔

'ہماری رانی۔ ہماری بے بی'۔

کیا ہوا؟۔ بچے ہو گئے یا پھر بھاگ گئی۔ کچھ تو بتاؤ'۔ اب نرگس کو وحشت ہونے لگی۔

'ہماری رانی۔۔ اس کا ایکسیڈینٹ ہو گیا۔۔ بڑی مشکل سے نعیم یہ جملہ ادا کر پایا اور وہ بھی رونے لگا۔

'کہاں؟ کیسے؟ نرگس اور جمال بیک وقت بولے۔

ہمارے گھر کی پچھلی سڑک پر۔ رات کے آخری حصے میں کوئی کار اسے کچلتے ہوئے چلی گئی۔ ہمیں صبح وہاں سے لوگوں نے آ کر بتایا۔ نعیم پھر رو پڑا۔

'تو رانی ہے کہاں؟ اور اس کے بچے؟ نرگس کا یاد آیا اس ہفتے تو وہ بچے دینے والی تھی۔

'کچھ پتہ نہیں آنٹی!' یاسمین سسکیوں کے دوران بولی۔ 'ہم جب معلوم ہونے پر بھاگ کر پہنچے تو تو کچلی ہوئی حالت میں پڑی ہوئی تھی۔ سانس چل رہی تھی۔ ویٹ کا کہنا ہے کہ اس کا بچنا بہت مشکل ہے۔ ہائے میری بے بی میری رانی۔۔۔' یاسمین کی آواز آنسوؤں میں ڈوب گئی۔

خدا اس کی مشکل آسان کرے یہ کہتے ہوئے نرگس نے دونوں کا ہاتھ منہ دھلوایا پھر زبردستی ایک

بسکٹ کے ساتھ چائے پلائی۔

وہ چاروں ہسپتال پہنچے تو ایک بری خبر ان کی منتظر تھی۔ ویٹ نے بتایا 'سوسوری ہم آپ کی بلی کو نہیں بچا سکے۔ خون بہت نکل گیا تھا اور سر بری طرح کچلا گیا تھا۔ چار بچے بھی ساتھ ہی مر گئے۔ لیکن دو بچوں کو ہم بچانے کی پوری کوشش کر رہے ہیں۔ حالانکہ بے حد کمزور ہیں۔'

روتے ہوئے یاسمین اور نعیم نے اپنی اشک آلود نگاہیں اٹھا کر ویٹ کی طرف بے یقینی سے دیکھا۔

'ہماری رانی کے بچے؟'

یس آئی ہوپ دے سروا وَیو۔

کیا ہم انہیں دیکھ سکتے ہیں؟ نعیم نے اٹکتے ہوئے پوچھا۔

''شوئر وائی ناٹ''۔ ویٹ نے بڑے نرم لہجے میں کہا اور ان دونوں کا ہاتھ تھام کر اندر لے گیا۔

نرگس وہاں کے ماحول کو دیکھ کر حیرت زدہ تھی۔ جانوروں کے ہسپتال میں آنے کا یہ پہلا موقعہ تھا۔ ویٹنگ روم میں ہر عمر کے لوگ اپنے اپنے پالتو جانوروں کو لئے بیٹھے تھے۔ کچھ بلیاں اور کتے گتے کے ڈبے میں نظر آ رہے تھے۔

ایک خرگوش بھی تھا اور ایک بڑا سا طوطا پنجرے میں بیقراری سے چکر لگا رہا تھا اور ٹیں ٹیں سے سارے ہسپتال کو سر پر اٹھا رکھا تھا۔ پتہ نہیں اس کو کیا تکلیف تھی۔ ایک بچہ اپنے زخمی کتے کو گود میں لیے بیٹھا تھا اور بڑے پیار سے کتے کے زخم پر ہاتھ پھیرتے ہوئے پوچھ رہا تھا۔ 'جارج! کیا بہت درد ہو رہا ہے؟' کتا جواباً اپنے پنجے اس کے ہاتھ پر رکھ کر ایک درد بھری چیاؤں کے ساتھ گویا یقین دلا رہا تھا 'درد تو ہے۔ لیکن تم فکر نہ کرو۔'

انسانوں کا جانوروں سے یہ پیار۔ ان کی تکلیف اور چوٹ کا احساس اور بے زبان جانوروں کا اپنے مالکوں کے لیے یہ محبت اور ممنونیت کا اظہار، نرگس کو ایک ایسی دنیا میں لے گیا جہاں ایک دوسرے کے دکھ درد میں شریک ہونے کے لیے انسان اور حیوان کا کوئی فرق کوئی امتیاز نہیں رہتا۔ جہاں رابطے کی صرف ایک زبان ہوتی ہے اور وہ ہے محبت کی۔ یاسمین اور نعیم کافی دیر اندر رہے، اور جب باہر آئے تو ان کی حالت غیر تھی۔ نرگس دونوں کو چمٹائے بہت دیر تک کھڑی رہی۔ پہلی مرتبہ اسے یہ احساس ہو رہا تھا کہ رانی سے اس کا انجانے طور پر ایک نامعلوم انسیت کا رشتہ بندھ گیا تھا۔ وہ ان دونوں کے آنسو پونچھتے ہوئے خود بھی رو پڑی۔ اے! نگوڑی کچھ عرصے اور جی لیتی۔ اپنے بچوں کو دیکھ لیتی۔ اور پھر سال بھر کی بھی تو نہ ہونے پائی۔۔۔ پھر ایسی ناگہانی موت۔۔

نعیم کہہ رہا تھا۔ ویٹ نے کہا ہے کہ ہم چاہیں تو رانی کی ڈیڈ بوڈی کو گھر لے جا سکتے ہیں۔
یاسمین بھی بول پڑی' آنٹی ہم اسے پراپر بیریل دیں گے۔

نرگس اور جمال نے حیرانی نے ان دونوں کو دیکھا۔ یہ تو بالکل ہی باؤلے ہو گئے ہیں۔ ان کے ایک جاننے والے کی بلی مرگئی تھی تو انہوں نے کالے پلاسٹک کے بیگ میں رکھ کر باہر کے ڈسٹ بن میں ڈال دیا تھا۔ اب یہ رانی کو کہاں دفن کریں گے اور کیسے؟

تھوڑی دیر میں رانی ایک بند ڈبے میں پلاسٹک کے تھیلے میں لپٹی ہوئی ان کے حوالے کر دی گئی۔ نعیم نے بڑی احتیاط سے وہ ڈبہ کار کے بوٹ میں رکھ دیا۔ کار میں سفر کے دوران نعیم اور یاسمین کی گفتگو کا محور یہی رہا کہ رانی کے لیے کون سی جگہ بہتر رہے گی۔ اپنے گارڈن کے علاوہ ان کے ذہن میں اور کوئی جگہ نہیں تھی۔

موسم اچانک ہی بدل گیا تھا گہرے بادل آئے اور بوندا باندی شروع ہو گئی۔ گھر پہنچتے پہنچتے تو بارش کا زور اور بڑھ گیا۔ نرگس کو لگا جیسے آسمان بھی رانی کی اچانک موت پر رو پڑا تھا۔ اس تیز بارش اور ہوا کی پروا کیے بغیر نعیم اور یاسمین اپنے گارڈن میں نکل گئے۔ نعیم کے ہاتھ میں پھاوڑا تھا اور یاسمین کے ہاتھ میں ٹارچ۔ کالے گہرے بادلوں میں دن کا اجالا چھپ گیا تھا۔ نعیم نے دو تین جگہ پھاوڑا زمین میں گھسانے کی کوشش کی۔

گیلی ہونے کے باوجود مٹی بہت سخت تھی اور یوں بھی ان کے گارڈن میں بڑے بڑے کئی درخت تھے جن کی جڑوں نے کیاریوں کا ایک بڑا حصہ ڈھانپ رکھا تھا۔ نرگس بے بسی سے نعیم کو پھاوڑا چلاتے دیکھ رہی تھی۔ یاسمین جھک کر چھوٹی کھرپی سے مٹی کھودنے میں اس کی مدد کرنے کی جدوجہد میں لگی ہوئی تھی۔ دونوں کے سر پر بارش کا پانی گر رہا تھا۔ تیز ہوا میں ان کے بال اڑ رہے تھے لیکن دونوں جیسے اپنے گرد و پیش سے بے خبر تھے۔ جمال ان دونوں کی محویت اور نرگس کے اضطراب کو دیکھ کر خود بھی بڑی بے بسی محسوس کر رہا تھا۔ اچانک نرگس جیسے دل ہی دل میں کوئی فیصلہ کر کے گارڈن میں نکل گئی۔ نعیم کے ہاتھ سے پھاوڑا چھینا اور اس کا اور یاسمین کا ہاتھ پکڑ کے فینس میں لگے دروازے سے اپنے گارڈن میں لگی گلاب کی کیاری کے پاس لے گئی۔

'یہاں دفن ہو گی ہماری رانی'۔ اس نے سفید گلاب کے اردگرد کی نرم مٹی کی طرف اشارہ کیا۔ 'ساری زندگی اس جگہ بیٹھنے کو ترستی رہی اب یہاں ابدی نیند سو لے گی اور میں بھی اسے کچھ نہیں کہوں گی'۔ اس کی آواز آنسوؤں میں ڈوب گئی۔

جمال کو اپنے کانوں پر یقین نہیں آ رہا تھا اور یاسمین اور نعیم اسے حیران حیران نظروں سے دیکھ رہے تھے پھر روتے ہوئے اس سے لپٹ گئے۔

اس رات ہوائیں بین کرتی رہیں اور آسمان دل کھول کر برسا۔ صبح بارش تھم گئی اور ہواؤں کو بھی قرار آ گیا۔ ہلکی سی سوگوار دھوپ نے پھیل کر ایک نئے دن کے آمد کی نوید دی۔ رات کا منظر گلاب کی کیاری میں لگے ہر پھول کی پتی پر آنسو کی بوند کی صورت ٹکا ہوتھا۔ سفید گلاب کے سامنے منٹوں میں گڑھا کھودلیا گیا تھا اور اس میں رانی دفنا دی گئی تھی۔ مٹی برابر کرنے کے بعد جمال کے کہنے پر وہاں ایک بھاری اینٹ رکھ دی گئی تھی تا کہ بارش کے پانی سے مٹی بہہ نہ جائے اور لومڑی یا کوئی دوسرا جانور وہاں کی مٹی کو کھود نہ ڈالیں۔ ساری کاروائی مکمل ہونے کے بعد اس باد و باراں میں اور رات کی تاریکی میں بھی چار ہیولے دیر تک گلاب کی کیاری کے سامنے کھڑے رہے۔

دن کی روشنی میں آفس جانے سے پہلے نعیم اور یاسمین پھر آئے۔ دونوں ایک دوسرے کا ہاتھ تھامے رانی کی آخری قیام گاہ کے سامنے کھڑے رہے۔ نرگس بھی دور سے انہیں دیکھ رہی تھی۔ کسی اپنے کو دفنانے کے بعد ایک قلبی سکون مل جاتا ہے کچھ ایسا ہی وہ محسوس کر رہی تھی۔

اگلے دو ہفتے بڑے مصروف گزرے۔ یاسمین اور نعیم روز ہی آفس کے بعد رانی کے بچوں کو دیکھنے جاتے۔ خوشی کی بات یہ تھی کہ دونوں بچے روبہ صحت تھے۔ نرگس کو ساری تفصیل ملتی رہتی۔ ایک چمکیلے روشن دن کو رانی کے بچے گھر آ گئے۔ ایک تو بالکل رانی جیسا تھا اور دوسرے کا سفید جسم اور اس پر کالے چکتے پڑے ہوئے۔

'یہ میرا ہیرا ہے'۔ نعیم نے رانی کی طرح کے بلے کی طرف اشارہ کیا 'اور یہ موتی ہے'۔ یاسمین نے دوسرا بلا گود میں اٹھاتے ہوئے کہا۔ 'ہماری رانی کے ہیرا موتی'۔

'ہم صرف ہیرا کو رکھ سکتے ہیں'۔ نعیم نے فکرمندی سے کہا 'ہم دونوں جاب کرتے ہیں۔ دو بلیوں کی ذمہ داری نہیں اٹھا سکتے۔ موتی کو ہیرا سے الگ کرنا ہوگا

'اس کی کوئی ضرورت نہیں'۔ نرگس نے موتی کو یاسمین سے لیتے ہوئے کہا۔ 'اسے میں رکھ لیتی ہوں۔ رانی کے ہیرا اور موتی ساتھ نہیں مگر پڑوس میں تو رہ سکتے ہیں۔

جمال کی آنکھوں میں ڈھیروں استعجاب دیکھ کر بولی 'تم کو بلیاں پسند ہیں۔ اب یہ حسرت پوری کرلو'

موتی نرگس کی گود میں جا کر یوں دبک گیا تھا جیسے ممتا سے ترسے ہوئے کسی بچے کو پیار ملنے پر

سکون مل جائے۔

نرگس موتی کو گود میں اٹھا کر سیدھی گلابوں کی کیاری کے پاس پہنچی۔

باہر تیز دھوپ چمک رہی تھی اور نیلے آسمان پر کہیں کہیں سفید بادلوں کے ٹکڑے تیرتے پھر رہے تھے۔رنگ برنگے گلاب کے پھول ہوا سے اٹھیلیاں کرتے ہوئے جھوم رہے تھے۔

'دیکھو موتی'۔اس نے سفید گلاب کے پودے کی طرف اشارہ کیا۔'یہاں تمہاری ماں۔۔رانی سو رہی ہے'۔

موتی نے ایک لمحے کے لئے آنکھیں کھولیں اور پھر نرگس کی گود میں منہ چھپالیا۔اسی پل نرگس کی نظر سفید گلاب کے پودے کی ایک شاخ پر جم کر رہ گئی جہاں ایک ننھی منی سفید کلی چٹکنے کے انتظار میں تھی۔

☆☆☆

Udan Tashtari by Tariq Shabnam(Bandipora) cell- 9906526432
طارق شبنم (بانڈی پورہ)

اڑن طشتری

جشن کی تیاریاں زور وشور سے جاری تھیں، شاہی محل کے خاص مشیر اور درباری بڑے انہماک سے خود جشن کی تیاریوں کی نگرانی کر رہے تھے۔ کیوں کہ دھرتی پر رہنے بسنے والے انسانوں کا صدیوں پرانا سنہرا خواب پورا ہونے والا تھا۔ ہاں! وہی خواب جس کی تعبیر ڈھونڈتے ڈھونڈتے انسان نے بے پناہ محنت کے ساتھ ساتھ کافی سرمایہ بھی خرچ کیا ہے۔ اس خواب کی تعبیر سے یقیناً انسانی زندگی کے ایک نئے ناقابل فراموش انقلاب کی شروعات ہونگی۔ اسی عظیم خواب کے پورا ہونے کی خوشی میں دھرتی پر ایک شاندار جشن کا اہتمام کیا گیا تھا، دھرتی کے شاہی محل کو دلہن کی طرح سجایا اور سنوارا گیا تھا۔ جشن میں شرکت کے لئے شہنشاہ دھرتی کے ساتھ ساتھ تمام بادشاہ اور وزیر بہ نفس نفیس موجود تھے۔

دفعتاً شاہی محل بارودی دھماکوں کی گن گرج سے گونج اٹھا اور درجنوں توپوں کی سلامی سے باضابطہ طور جشن کا آغاز ہوگیا، جس کے ساتھ ہی شہنشاہ دھرتی، بادشاہ، وزیر، بڑے بڑے سائینس دان اور وہاں موجود دھرتی کے دیگر ذہین ترین لوگ فرط نشاط وامبساط سے جھوم اٹھے۔ رقص وسرور کی محفل شروع ہوگئی، جس میں رنگ ونور کی بارش، زرق وبرق لباسوں میں ملبوس مچھلیوں کی طرح پھدکتی ہوئی نازک اندام حسینائیں اور مست ومدہوش کرتی ہوئی موسیقی کا دور چلنے کے بعد شہنشاہ دھرتی بڑے ہی کروفر کے ساتھ سٹیج پر جلوہ افروز ہوگیا۔

''پیارے دھرتی واسیو۔۔۔۔۔۔ہم نے اپنی ذہانت، تدبر اور محنت سے دھرتی پر ترقی کی آخری حدوں کو چھولیا ہے۔ اب ایک اور سیارے مریخ پر قدم رکھ کر وہاں انسانی زندگی کی شروعات کرنے اور ترقی کے نئے جھنڈے گاڑھنے کا وقت آپہنچا ہے۔ مجھے اپنے دھرتی واسیوں سے یہ بات شیر کرتے ہوئے بے انتہا فخر اور خوشی محسوس ہورہی ہے کہ ہمارا یہ صدیوں پرانا خوب صورت خواب بہت جلد پورا ہونے والا ہے۔۔۔۔''۔

شاہی محل تالیوں اور سٹیوں سے گونج اٹھا، وہاں موجود لوگ شاداں وفرحان اٹھ کر رقص کرتے ہوئے جھومنے لگے۔ جنہیں شہنشاہ نے ہاتھ ہلا ہلا کر خاموش ہونے کے لئے کہا۔

''اسی عظیم اور قابل رشک کامیابی کے تناظر میں ہم نے اس شاندار اور پروقار جشن کا انعقاد کیا ہے ۔آپ لوگوں کی خوشی یہ جان کر دوبالا ہوگی کہ اس جشن کو رونق بخشنے کے لئے ہم نے سیارہ مریخ پر راج کرنے والی ملکہ امن کو مدعو کیا ہے۔ جن کے سامنے ہم دھرتی پر ہونے والی اس بے پناہ ولازوال ترقی کے سارے راز کھول کر مریخ پر انسانی زندگی شروع کرنے کے اس بڑے مہادے کو حتمی شکل دیں گے پھر ہمیں دھرتی کے ساتھ ساتھ مریخ پر راج کرنے اور دیگر سیاروں پر پاؤں پسارنے سے کوئی بھی طاقت نہیں روک سکتی۔۔۔۔۔۔''۔

شہنشاہ دل ودماغ میں تکبر کے بلند وبالا پہاڑ لئے دیکھتے ہی دیکھتے تختہ سلیمان پر جا بیٹھا اور بڑے ہی فخریہ انداز میں دھرتی پر آباد انسانی دنیا کی ترقی کا تفصیل کے ساتھ ذکر کرنے لگا۔ ساتھ ساتھ ایک بڑے پردے کے ذریعے انسانی ترقی کے مختلف رنگوں کی نمائیش بھی ہوتی رہی۔ جس کا لب لباب یہ تھا کہ اگلے وقتوں میں زمین پر رینگنے والا یا بیل گاڑیوں میں سفر کرنے والا انسان آج بغیر کسی خوف کے خلاؤں میں اڑ رہا ہے۔ جنگلوں اور معمولی سے کچے مکانوں میں رہنے کے بجائے اب اونچے اونچے شاندار محلوں میں عیش وعشرت کی زندگی گزار رہا ہے۔ درختوں کے پتے اور جنگلی پھلوں پر گزارہ کرنے کے بجائے قسم بہ قسم کی اعلیٰ سے اعلیٰ ضیافتوں سے لطف اندوز ہو رہا ہے۔ یہاں تک کہ کروڑوں انسان ضرورت سے زیادہ غذا کھانے کی وجہ سے نہ صرف موٹاپے بلکہ سخت ترین بیماریوں کے شکار ہو رہے ہیں۔ لیکن نئی نئی بیماریوں کے وجود میں آنے کے ساتھ ساتھ سائینس کی ترقی کی بدولت ان کا بہتر علاج ومعالجہ دستیاب ہے، جب کہ بڑے بڑے ہوٹلوں اور دیگر تقریبات میں لاکھوں کروڑوں کی خوردنی اشیاء کوڑے دانوں کی نظر ہو جاتی ہیں۔ جہالت اور ناخواندگی کی جگہ علم کے نور نے لے لی ہے اور چاروں اور اعلیٰ سے اعلیٰ تعلیمی دانشگاہوں کا جال پھیلا ہوا ہے۔ اونچے اونچے پہاڑوں کو چیر کر شاہراہیں اور ریلوے پٹریاں تعمیر ہو چکی ہیں۔ اطلاعاتی ٹیکنالوجی نے انسانی زندگی میں ایک نیا ناقابل فراموش انقلاب بپا کر دیا ہے۔ غرض وہ دھرتی واسیوں نے ترقی کی جن حدوں کو چھولیا ہے یہی ترقی کی معراج ہے۔۔۔۔۔۔ شہنشاہ نے سینہ پھُلا کر اس بات کا بھی خلاصہ کیا کہ ہمارے خلائی ماہرین مریخ پر گاف کلب، سوئمنگ پول بڑے بڑے شاپنگ مال اور ہوٹل تعمیر کرنے کے منصوبے مکمل کر چکے ہیں۔ پلاٹوں کی الاٹمنٹ کا سلسلہ جاری ہے اور بہت جلد وہاں مکانات تعمیر

کرنے کے لئے عملی اقدامات کئے جائینگے۔

شہنشاہ دھرتی الف لیلیٰ کے جادو گھر بادشاہ کی مانند بڑی ہی چابک دستی اور فنکاری سے انسانی ترقی کے گن گانے میں مصروف تھا کہ اچانک زوردار سائیرن بج اٹھا اور شہنشاہ اپنی بات کا موضوع بدلتے ہوئے یوں گویا ہوا۔

''حاضرین محفل۔۔۔۔۔۔دل تھام کے رہیے، وہ مبارک گھڑی آ گئی جس کا ہمیں شدت سے انتظار تھا۔۔۔۔۔مریخ کی سلطنت کی ملکہ امن
دھرتی پر قدم بہ رنجیدہ ہو رہی ہیں''۔

اس کے ساتھ ہی شہنشاہ اور سارے درباری ملکہ کے استقبال کے لئے شاہی محل سے باہر آ گئے ۔کچھ لمحوں میں ہی ملکہ بڑی شان و شوکت کے ساتھ محل میں داخل ہو گئی، وہاں موجود حاضرین نے بھی کھڑے ہو کر اس کا پر جوش استقبال کیا جب کہ کئی توپوں کی سلامی بھی دی گئی۔توپوں کے دھماکوں گن گرج سے ملکہ کے چہرے پر خوف اور رنج کی لکیریں نمودار ہو گئیں، تنگ آ کر اس نے انگلیاں کانوں میں ٹھونستے ہوئے پریشان لہجے میں شہنشاہ سے سوال کیا۔

''شہنشاہ دھرتی۔۔۔۔۔۔یہ بارود کے دھماکے کہاں اور کیوں ہو رہے ہیں؟''

''ملکہ۔۔۔۔۔۔یہ دھماکے آپ کے اعزاز میں کئے جا رہے ہیں''۔

''دھماکے اور اعزاز۔۔۔۔۔۔؟''

وہ حیرت زدہ سی ہو گئی۔

''اس ترقی یافتہ دھرتی پر دھماکہ خیز مواد بھی موجود ہے؟''

''ملکہ۔۔۔۔۔۔ہمارے پاس ایٹم بم، نیوکلیر بم، ہائیڈروجن بم اور دیگر کیمیاوی بموں کے علاوہ بے شمار قسم کا گولہ بارود موجود ہے۔

شہنشاہ نے ترقی بہ ترقی جواب دیا''۔

''یہ سب تو تباہی اور بربادی کا سامان ہے۔۔۔۔۔۔میری جانکاری کے مطابق ایک زمانے میں اس کا استعمال کر کے دھرتی کے کئی خوب صورت شہروں کو کھنڈرات میں تبدیل کر کے زندگی کو نیست و نابود کیا گیا تھا۔ترقی کے اس دور میں بھلا ان جان لیوا تباہ کن ہتھیاروں کی ضرورت کیا ہے؟''

''ملکہ۔۔۔۔۔۔یہ۔۔۔۔۔۔یہ ہتھیار ہماری ترقی کا حصہ ہیں''۔

شہنشاہ نے شرمندہ ہو کر گول مول سا جواب دیا۔

''اس پر تو بہت سرمایہ خرچ ہوتا ہوگا؟''

''ملکہ۔۔۔۔۔۔آپ کا اندازہ بالکل درست ہے،لیکن ہمارے پاس بھلا کس چیز کی کمی ہے۔ اب ہم ہر لحاظ سے خود کفیل ہیں اور سارے دھرتی واسی انتہائی خوشحال زندگی گزر رہے ہیں''۔

''سامین کرام۔۔۔۔۔۔دل تھام کے رہیے۔۔۔۔۔۔اب آپ کے سامنے آرہی ہیں مریخ پر راج کرنے والی ملکہ امن''۔

کچھ وقت تک شہنشاہ سے محو گفتگو رہنے اور دھرتی پر ہوئی قابل رشک ترقی کا بچشم خود مشاہدہ کرنے کے بعد تالیوں کے گونج کے ساتھ ملکہ سٹیج پر جلوہ افروز ہوگئی۔

''پیارے دھرتی واسیو۔۔۔۔۔۔بے شک آپ نے اپنی ذہانت اور محنت سے ترقی کی آخری حدوں کو چھولیا ہے۔ مجھے یہ جان کر بے حد مسرت ہوئی کہ دھرتی پر اب کسی بھی چیز کی کمی نہیں ہے اور سارے دھرتی واسی خوشحال اور پرسکون کی زندگی بسر کر رہے ہیں۔۔۔۔۔۔''۔

''بھوکوں کو روٹی دو۔۔۔۔۔۔ننگوں کو کپڑا دو۔۔۔۔۔۔''۔

''شہنشاہ تیرے راج میں۔۔۔۔۔۔بچے بھوکے مرتے ہیں۔۔۔۔۔۔''۔

دفعتاً شاہی محل کے چاروں اطراف ایک شور سا بھرپا ہوگیا، جو ہر لمحہ کے ساتھ بڑھتا ہی جارہا تھا۔شور سن کر شہنشاہ کے عقل کے طوطے اڑ گئے جب کہ ملکہ بھی پریشان سی ہوگئی اور بے قراری کے عالم میں شہنشاہ سے مخاطب ہوئی۔

''شہنشاہ۔۔۔۔۔۔دھرتی پر یہ کیسا شور ہے؟''

''ملکہ۔۔۔۔۔۔یہ لوگ ہماری ترقی کے دشمن ہیں۔۔۔۔۔۔آپ اپنی بات جاری رکھیے۔۔۔۔۔۔میں سب سمبھالوں گا''۔

ملکہ نے اگرچہ اپنی بات جاری رکھنی چاہی لیکن شور شرابے میں وہ خود بھی اپنی بات نہیں سن پا رہی تھی۔

جب بادلوں کی طرح گرجتے نعروں کی گونج اور سخت شور سے ملکہ کے کانوں کے پردے پھٹنے لگے تو اس نے اپنے ذاتی سیکریٹری، جو دیکھنے میں جاسوسی ناولوں کا پراسرار کردار لگتا تھا، کو حالات کا جائیزہ لینے کا حکم صادر فرمایا، حکم کی تعمیل کے بعد وہ جلد ہی ملکہ کے سامنے حاضر ہوکر گویا ہوا۔

''ملکہ کا اقبال بلند ہو۔۔۔۔۔۔دھرتی کے اس شاہی محل کو پھٹے پرانے چیتھڑوں میں ملبوس بے شمار فاقہ مست دھرتی واسیوں نے گھیر لیا ہے''۔

''مگر کیوں؟''

''ملکہ عالی جان۔۔۔۔۔۔وہ انصاف مانگتے ہیں''۔

''انہیں کیا پریشانی ہے؟''

''اس ترقی یافتہ دھرتی پر کروڑوں لوگ بے انصافی کی تپش میں نڈھال غربت، افلاس اور بھکمری کے شکار ہیں۔۔۔۔۔۔بھوک کی اس منڈی میں روزانہ بہت سے معصوم بچے اور بزرگ انساں بلک بلک کر موت کا نوالہ بن جاتے ہیں، جن کا کوئی پرسان حال نہیں ہے''۔

ملکہ کے خوش وخرم چہرے پر ایک دم تاسف و افسردگی کی برف جم گئی اور اور جھیلوں سی اتھاہ گہرائیوں والی آنکھوں میں اُداسی پھیل گئی۔

''او مائی گارڈ۔۔۔۔۔۔اس قدر گھمبیر صورت حال اور اتنا بڑا دھوکہ۔۔۔۔۔۔۔''۔

اس نے دھرتی کے شہنشاہ اور اس کے اردگرد موجود بادشاہوں پر ایک نفرت بھری نگاہ ڈالتے ہوئے کہا اور غصے کی حالت میں تیز تیز قدم اٹھاتے ہوئے ایسے جانے لگی جیسے کوئی تتلی مکڑی کے جالے سے آزاد ہو کر بھاگ رہی ہو۔

'' ملکہ امن۔۔۔۔۔ملکہ۔۔۔۔۔۔''۔

شہنشاہ اور اس کے درباری بوکھلاہٹ کے عالم میں اس کے پیچھے پیچھے چلتے ہوئے اس کو روکنے کے لئے آوازیں دیتے رہے لیکن اس نے کسی کی ایک نہ سنی اور اپنی اڑن طشتری میں بیٹھ کر فضاؤں میں گُم ہو گئی۔

☆☆☆

Kal Aaj aur Kal by Dr. Sajid Ali (Buland Shahar) cell- 9457757476
ڈاکٹر ساجد علی (بلند شہر)

کل آج اور کل

سرفراز کی والدہ نے جب بیٹے کی دلچسپی تعلیم حاصل کرنے کی طرف دیکھی ۔اور ان کو محسوس ہوا کہ بچپن سے ہی سرفراز کتابوں سے رغبت رکھتا ہے۔ باضابطہ تعلیم شروع ہونے سے پہلے ہی بیٹے نے مختلف مضامین جیسے ہندی، انگریزی، ریاضی وغیرہ کی بنیادی معلومات حاصل کر لی ہے۔تب ایک روز موقع دیکھ کر اپنے شوہر دلنواز صدیقی سے بات کی۔

''میرا خیال ہے کہ سرفراز کا داخلہ کسی اچھے اسکول میں کرا دیا جائے۔ پڑوس کے کئی بچے Children Acedemy میں زیر تعلیم ہیں۔جس میں بارہویں جماعت تک کی پڑھائی CBSE بورڈ سے انگریزی میڈئم میں کرائی جاتی ہے۔کیوں نہ ہم بھی سرفراز کا داخلہ وہیں کروا دیں؟''

''وہ تو ٹھیک ہے بیگم۔مگر کیا تم نے اس اسکول کے اخراجات اور معیار نہیں دیکھا؟ سال پورا نہیں ہوتا کہ اخراجات میں اضافہ ہو جاتا ہے۔ایسے اسکول کے اخراجات برداشت کرنا محدود آمدنی میں ممکن نہیں''۔دلنواز صدیقی نے حالات کو سامنے رکھتے ہوئے بیگم سے کہا۔

''آخر سرکاری اسکولوں میں بھی بچے تعلیم حاصل کرتے ہیں۔حکومت تعلیم پر کتنا خرچ کرتی ہے۔ یہ تو عوام کے ذمہ داری ہے کہ وہ ایسی اسکیموں سے کتنا فائدہ حاصل کرتے ہیں؟'' دلنواز صدیقی ایک اسکول میں مدرس کی حیثیت سے سرکاری ملازم تھے۔ سرکاری اسکولوں کی حمایت میں انہوں نے اپنی بات کو واضح کیا۔

اس طرح سرفراز کو پاس کے ایک سرکاری اسکول میں داخل کروا دیا گیا۔

سرفراز نے محنت سے پڑھائی جاری رکھی۔اور PCM میں اوّل درجہ سے بارہویں پاس کی۔گھر میں خوشی کا ماحول تھا۔لوگ سرفراز کو اور اہل خانہ کو مبارکباد پیش کر رہے تھے۔

ایک پڑوسی نے دلنواز صاحب کی طرف مخاطب ہوتے ہوئے کہا''میاں!اب

صاحبزادے کے مستقبل کے بارے میں کیا سوچا ہے؟ میرا مطلب ہے کہ اسے مزید کون کا کورس کرانے کا ارادہ ہے؟''

دلنواز صدیقی نے ان کی بات کو ترجیح دیتے ہوئے کہا'' آپ ہی کچھ مشورہ دیجئے۔ بچے کو اب کیا کرانا صحیح رہے گا؟''

پڑوسی نے جواب دیا''محض BA یا MA کرنے سے کوئی فائدہ نہیں۔آج کل پیشیورانہ کورس کا زمانہ ہے۔ بیٹے کو کسی Proffessional Course میں داخلہ دلوادیں۔ ریاضی میں دلچسپی کے سبب B.Tech کرانا بہتر ہوگا۔''

دلنواز صاحب کی ذہنی کیفیت کو بھانپتے ہوئے انہوں نے مزید کہا'' کچھ نہیں تو Investment سمجھ کر لگا دیجئے۔اولاد لائق ہے۔انشاءاللہ بہتر بدل ملے گا۔آخر اب تک کس کے لئے کمایا ہے؟ بچوں کی کامیابی بھی والدین کے لئے سرمایہ ہے۔''

اس طرح اَبّا نے بخوشی سرفراز کا داخلہ انجینئرنگ میں کرادیا۔

'' پاپا! دیکھئے نہ۔میرے ساتھی مہنگے موبائل استعمال کرتے ہیں۔اسکول اور باہر جانے کے لئے موٹر سائکل کی سواری کرتے ہیں۔ پھر میں یہ سب کیوں استعمال نہیں کرسکتا؟ مجھے اپنے ساتھیوں کے بیچ اس طرح سے رہتے ہوئے اچھا نہیں لگتا۔امّاں ! آپ ہی ابّا سے کہیں۔وہ مجھے بھی یہ سب کیوں نہیں دلوا دیتے۔آخر ان سب کے استعمال کرنے میں کیا برائی ہے؟ آج کل یہ سب انسان کی ضروریات بن چکی ہیں۔کیا میں ان کا استعمال کرنے کے لائق نہیں؟'' یہ وہ سوالات تھے جو امتیاز اپنے والدین سے کررہا تھا۔

سرفراز صدیقی کا فرزند امتیاز شہر کے نامی اسکول DPS میں گیارہویں جماعت کا طالب علم تھا۔گزشتہ سال ہی دسویں پاس کی تھی۔جس میں 90 فیصد نمبرات کے ساتھ اپنی جماعت میں دوسرے درجہ پر رہا تھا۔ جہاں اس کے ساتھ شہر کے نامی شخصیات کے بچے زیرِ تعلیم تھے۔روپے پیسے کی فراوانی کے سبب مہنگے شوق رکھتے۔ان میں سے اکثر تو پڑھائی کے مقابلے اونچے معیار کا دکھاوا کرنے کے عادی تھے۔

سرفراز صاحب اب PWD میں AE کے عہدے پر فائز ہو چکے تھے۔ایسا نہیں تھا کہ وہ اپنے بیٹے کی ضروریات سے ناواقف تھے۔مگر ان کا نظریہ تھا کہ ان کا بیٹا فضول خرچ اور بری عادات سے خود کو دور رکھے۔اس میں ابھی سے اچھے برے کی تمیز پیدا ہو۔وہ زندگی کی حقیقتوں کو سمجھے

۔اور بنیادی ضروریات کو ترجیح دے۔جن میں اس کی تعلیم وتربیت اہم تھی۔

سرفراز کے والد دلنواز صدیقی PRT کی حیثیت سے ایک سرکاری اسکول میں تدریسی کام انجام دیتے تھے۔مذہبی ہونے کے ساتھ اصول کے پابند انسان تھے۔۲۰ سالہ ملازمت کے دوران اپنے کام کو ایمانداری سے انجام دیا تھا۔اور اپنی صاف شفّاف شخصیت کے لئے پہچانے جاتے تھے۔ماہانہ تنخواہ گھر کے اخراجات کو کافی ہوجایا کرتی تھی۔

سرفرا کو اپنے والد کی اصول پسندی پر ناز تھا۔اوران اصولوں کو وہ اپنی آئندہ نسل میں منتقل کرنا چاہتے تھے۔وہ یادیں سرفراز کے ذہن میں اکثر تازہ ہوجاتیں، جب ان کے والدان کو پاس بیٹھا کراس طرح کی گفتگو کیا کرتے تھے۔

سرفراز صدیقی نے بیٹے کو بلا کر پاس بیٹھایا۔اور شفقت سے اس کی پشت پر اپنا ہاتھ رکھتے ہوئے بولے''بیٹا! آج تم جو یہ سب سہولیات دیکھ رہے ہو۔ویسی سہولیات ہمارے دور میں نہیں تھیں۔تعلیم حاصل کرنے کے بعد بھی ملازمت ملنے تک ہمیں سواری کی سہولت میسر نہیں تھی۔اسکول کالج جانے کے لئے ہم وقت سے پہلے گھر سے نکل جاتے۔تا کہ وقت پر وہاں پہنچ سکیں۔ایسا نہیں ہے کہ ہمارے پاس روپے پیسے نہیں تھے۔ہم اس کو آئندہ کسی ضرورت کے لئے بچانا پسند کرتے تھے۔یہ سب ہم نے بہت محنت سے اکٹھا کیا ہے۔آج خدا کا عطا کیا ہوا جو کچھ ہمارے پاس ہے۔وہ نیک نیتی سے حاصل کیا ہوا سرمایہ ہے۔آج تم کو یہ سب سہولیات میسر ہیں۔ہم تم کو وہ سب دینے کی خواہش رکھتے ہیں جس کی تم کو ضرورت ہے۔بس تم سے اتنا چاہتے ہیں کہ تم اس سب کی اہمیت اور وقعت کو سمجھو۔تمہارے سامنے اپنے آباؤ اجداد کی نمایاں زندگی کا نقشہ ہمیشہ رہے۔تا کہ تم ہمارے معاون ومشیر بن سکو۔تمہیں اپنی زندگی کو بہتر بنانے کے لئے اپنا ہر قدم سوچ سمجھ کر رکھنا ہے۔''

اپنی بات مکمل کرنے کے بعد انہوں نے بیٹے امتیاز کے چہرے پر نظر ڈالی۔تو بیٹے کو کسی گہری سوچ میں مبتلا پایا۔بیٹے کی آنکھوں میں نمی تھی۔جو اس طویل گفتگو کے اثر انداز ہونے کا احساس دلا رہی تھی۔طویل خموشی کے بعد امتیاز نے اپنے لبوں کو جنبش دیتے ہوئے جواب دیا''ابّا! میں آپ کی باتوں کو سمجھ گیا۔مجھے اب ان چیزوں کی کوئی ضرورت نہیں۔میں خوب محنت سے تعلیم حاصل کروں گا۔آئندہ آپ کو کبھی شکایت کا موقع نہیں دوں گا۔آپ مجھ پر بھروسہ رکھیں۔میں وقت کی پابندی کے ساتھ سبھی کام انجام دینے کی کوشش کروں گا۔''بیٹا والد کے سامنے اپنے دلی جذبات کا اظہار کررہا تھا۔دل سے نکلی بات دل پر اثر کرچکی تھی۔

دلنواز صدیقی اور جمیل احمد پڑوسی تھے۔جمیل احمد PWD میں ملازم تھے۔ڈیوٹی کے اوقات میں بھی ملازمت پر کم دھیان دیتے۔ دیگر مصروفیات میں زیادہ وقت نکلتا۔دفتر میں رہتے ہوئے یہ جستجو رہتی کہ کیسے آمدنی میں اضافہ ہو۔ فارغ اوقات دوستی اور تعلقات قائم کرنے میں گزارتے۔نہایت موقع شناس اور مزاج شناس انسان تھے۔کام نکلوانے کے گر میں ماہر تھے۔جبکہ دلنواز صدیقی مذہبی اور اصول کے پابند انسان تھے۔ملازمت سے سبکدوش ہونے تک اپنے آبائی گھر کی مرمّت بھی نہ کرا سکے۔رٹائرمنٹ پر ملنے والے فنڈ اور گریچوٹی کی رقم سے عمر کے آخری پڑاؤ پر کئی ادھورے کام پورے کئے۔مختلف مزاج کا ہونے کے بعد بھی دونوں میں اچھی دوستی تھی۔وقت پر ایک دوسرے کے کام آجاتے۔جمیل احمد کے بھی ایک بیٹا تھا رفیق احمد۔اوپری آمدنی کے باعث جمیل احمد کے گھر آسائش کے تمام اسباب موجود تھے۔ بیٹے کی پرورش بڑے لاڈ پیار میں ہوئی۔مہنگے اسکول میں رفیق احمد کو تعلیم دلائی گئی۔تربیت کے فقدان کے سبب صاحبزادہ عیش اور خرافات میں مبتلا ہوتا گیا۔محنت کشی کی جگہ آرام طلبی نے لے لی۔تعلیم حاصل کرنے کے زمانے کو یوں ہی گزارتے گئے۔رفیق احمد کا دل بارہویں پاس کرنے کے بعد اچھٹ گیا۔تعلقات اور پیسے کی بنیاد پر کسی طرح بیٹے کو ملازمت دلوادی۔جمیل صاحب کے رٹائرمنٹ اور پھر ان کے وصال کے بعد آمدنی کے ذرائع کم ہوتے گئے۔گھر میں وہی پرانا طرز زندگی باقی رہا جو عادات و معیار ان کی زندگی کا حصہ ہو چکے تھے۔اس پر وہ کسی طرح کا سمجھوتہ کرنے کو تیار نہ ہوئے۔نتیجہ یہ ہوا کہ خوشحالی کے دن کب بدحالی میں تبدیل ہو گئے۔ان کو اس کا احساس ہی نہ ہوا۔محدود آمدنی میں گزارہ کرنا دشوا ہوتا گیا۔رفیق احمد کی بیوی جو کہ ایک اہل سروت گھرانے سے تعلق رکھتی تھی۔ان کے تنگی کے دنوں کو برداشت نہ کرسکی۔اور طلاق لے کر رفیق احمد سے علاحدہ زندگی بسر کرنے لگی۔رفیق احمد روزانہ کے جھگڑوں، تنگی اور تنہائی کو برداشت نہ کرسکا۔آخر تنگ آکر اس نے اپنی زندگی کو اپنے ہاتھوں ختم کرلیا۔

☆☆☆